ایکشن سے بھرپور سنسنی خیز ناول
دُشمن
ایم الیاس

میرے ساتھ کچھ دن سے ایسے واقعات ہو رہے تھے کہ میں اسے محض اتفاقات قرار نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا' میں تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ میں کوئی دولت مند آدمی نہیں ہوں۔ سیاسی لیڈر نہیں ہوں۔ میری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں ہے۔ کسی رشتے دار سے جائیداد کا جھگڑا نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کسی کے خلاف عدالت میں کوئی گواہی دی ہے۔ میں ملازمت کر کے اپنی زندگی گزار رہا ہوں۔ دفتر' ہوٹل' گھر اور مطالعہ یہ میری زندگی کے محور تھے۔ مجھے کچھ ایسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی میری جان کا دشمن ہو گیا ہے' پھر بھی میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھ کر ذہن سے جھٹک دینے کی کوشش کی تھی۔

کوئی دس بارہ دن پہلے کی بات ہے کہ میں ایک سنسنی خیز جاسوسی ناول رات دیر تک پڑھتا رہا وہ اس قدر دلچسپ تھا کہ میں اسے ختم کئے بغیر نہیں رہا۔ میں نے بستر پر لیٹنے سے پہلے بتی بجھائی اور ارادی طور پر پردہ ہٹا کر باہر جھانکا باہر ایک گرم سیاہ سنسان رات کا اندھیرا تھا۔ بادل یوں برس رہے تھے کہ جیسے مرگِ ناگہاں پر رونے والوں کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ سامنے والے گھر کے برآمدے میں اندھیرے میں ایک شخص پُراسرار انداز سے کھڑا تھا اگر وہ اپنا سگریٹ نہیں جلاتا تو مجھے اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ ایک دراز قد اور مضبوط جسم کا شخص تھا۔ دیا سلائی کی روشنی میں' میں نے اس کا چہرہ دیکھا تو میرے سارے بدن پر سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ کسی پیشہ ور قاتل کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی پردہ چھوڑ دیا' یہ شخص کس لئے یہاں کھڑا ہے؟ میں

نے سوچا شاید ڈکیتی یا کسی اور ارادے سے کھڑا ہو۔ اس گلی میں چوہدری ابو القاسم کا مکان تھا۔ وہ اس محلے کا سب سے امیر ترین شخص تھا۔ اس بات کا امکان تھا وہ اس کے یہاں چوری کے ارادے سے آیا ہو۔ میں نے سوچا کہ اس چور بدمعاش کو کس طرح چوری کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔ میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ میں نے گلی میں قدموں کی آوازیں سنیں۔ میں نے کھڑکی کے پاس جا کر پردے کو اتنا سرکایا کہ ایک جھری سی بن گئی۔ اس جھری میں سے جھانکا اسی لمحے آسمان پر بڑے زور سے بجلی چمکی تھی۔ اس روشنی میں' میں نے ایک اور بدمعاش کو اس کے پاس کھڑے دیکھا۔ وہ اپنی جیب سے چاقو نکال کر میرے مکان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

میں کوئی بزدل یا ڈرپوک شخص نہیں تھا میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے میں ان دو خطرناک اور مسلح بدمعاشوں سے مقابلہ کر سکوں۔ تاہم میں نے باورچی خانے میں جا کر سبزی کاٹنے والی چھری اٹھالی اور کمرے میں بتی جلادی تا کہ انھیں یہ خبر ہو کہ میں جاگ رہا ہوں۔ اس رات کوئی واقعہ پیش نہیں آیا لیکن میں نے ساری رات آنکھوں پر کاٹی۔

اس کے دوسرے دن میں اس ہوٹل میں رات کا کھانا کھا رہا تھا جو میرے محلے میں تھا کھانا کھاتے ہوئے میری نگاہ مخالف سمت کے کونے والی میز پر پڑی' یہ شخص بھی اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے بدمعاش لگ رہا تھا وہ مجھے اپنی لال لال آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کے بشرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے ختم کئے بغیر نہیں رہے گا۔

اتوار کے روز میں سہ پہر کے وقت حسب معمول رمنا گرین پارک گیا میں شام چار بجے سے چھ بجے تک وہاں وقت گزارتا تھا۔ میں ایک خالی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک نوجوان لڑکی جو ساڑھی میں ملبوس تھی' جس کی پیشانی پر بندیا لگی تھی اور اس نے اپنے بالوں کے جوڑے میں پھول لگا رکھا تھا وہ بینچ پر مجھ سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی۔ لڑکی حسین بھی تھی اور پُرکشش بھی۔ اس نے میری طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا جیسے وہ شناسا ہو۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی ویسے وہ ایسی لڑکی دکھائی نہیں دیتی تھی کہ اس کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کی جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں سے اٹھ گیا کہیں میرے کسی جاننے والے نے مجھے ایک لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا تو وہ اپنے دل میں میرے بارے میں کیا سوچے گا؟ میرے دفتر کے لوگ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اکثر یہاں آتے رہتے تھے۔ چونکہ میرے پاس خاصا وقت تھا اور میری جیب میں چھ بجے کے شو کا ٹکٹ تھا' میں مٹرگشت کرنے لگا۔ میں نے تھوڑی دیر کے بعد محسوس کیا کہ وہ نوجوان لڑکی غیر محسوس انداز سے میرے تعاقب میں ہے۔ معلوم نہیں کس لئے میرے تعاقب میں تھی۔ میں اس قماش کا آدمی نہیں تھا۔ میں نے کبھی کسی عورت کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جب سے بے روزگاری' مہنگائی اور ملک کی معاشی بدحالی میں اضافہ ہوا تھا تب سے بدکاری میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کوئی چھ بجے تک وہ میرے تعاقب میں رہی اس عرصے میں اس نے ایک بار بھی میرے پاس آنے یا مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس نے ایک لمحے بھی مجھے اپنی نگاہوں کی گرفت سے نہیں نکلنے دیا تھا۔ آخر وہ کیا چاہتی تھی؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک پُراسرار سی لڑکی تھی اس کی حرکات و سکنات بھی پُراسرار سی تھیں۔

میں نے ٹھیک پونے چھ بجے رمنا گرین پارک سے باہر آ کر ایک آٹو رکشا لیا اور مدھومتیا سینما پہنچا۔ وہاں ایک رومانی اور جذباتی فلم لگی ہوئی تھی۔ اس کا ٹکٹ میں نے پہلے ہی سے بک کرا لیا تھا' فلم بہت رش لے رہی تھی' میں جیسے ہی اندر جا کر بیٹھا سینما ہال میں اندھیرا چھا گیا اور فلم شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے دائیں جانب جو خالی سیٹ تھی اس پر کوئی آ کر بیٹھ گیا۔ شاید کوئی عورت تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اطمینان سے فلم دیکھتا رہا۔ البتہ میں بائیں جانب سمٹ گیا تھا تا کہ نادانستگی میں میرا بازو اس کے جسم سے مس نہ ہو جائے۔

جب انٹرول ہوا تو میرے دائیں جانب بیٹھی ہوئی لڑکی کی شکل دیکھ کر میں بری طرح چونک پڑا وہی لڑکی تھی جو پارک میں ملی تھی اور میرے تعاقب میں تھی' مجھے ایک نامعلوم سے خطرے کا احساس ہوا کیونکہ اس کے ساتھ ایک شخص بھی تھا۔ لڑکی نے معلوم نہیں اس سے کیا کھسر پھسر کی کہ وہ مجھے خشمگیں نظروں سے گھورنے لگا تھا۔ میں نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ یہاں سے کھسکوں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لڑکی مجھ پر کوئی الزام عائد کر کے کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے۔ اس کے ہمراہ جو شخص تھا وہ مجھے اچھا آدمی دکھائی نہیں دیا تھا۔

میں ایک روز دفتر سے نکل کر فٹ پاتھ پر آیا' سڑک پار کرنے کے ارادے سے کھڑا ہو گیا جیسے ہی سگنل بند ہوا اور سیلاب کی طرح بہتا ہوا ٹریفک رک گیا تو میں فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پار کرنے کی کوشش کرنے لگا' کیونکہ ہجوم بہت تھا۔ میں سب سے پیچھے تھا یک لخت مخالف سمت سے ایک موٹر سائیکل سوار سگنل توڑتا ہوا میری طرف اس قدر تیز رفتاری سے آیا کہ میں نے اگر اسے نہ دیکھا ہوتا اور میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا نہ ہوتا تو میں یقیناً اس کی زد میں آجاتا۔ اس نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے کسی چیز سے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں ہٹ نہ جاتا تو وہ چیز میرے جسم کے کسی بھی حصے پر لگ جاتی۔ پھر وہ چیز اس کے ہاتھ سے نکل کر سڑک پر گر پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو میری آنکھیں خوف سے پھیل گئیں وہ ایک خوفناک قسم کا خنجر تھا۔

اب میرے لئے کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ کوئی نادیدہ دشمن میری موت کا خواہاں ہے اور میری زندگی کا چراغ گل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ میں جب بھی کہیں جاتا تھا یا اپنے گھر میں ہوتا تھا تو ہر طرف نادیدہ دشمن کی آنکھیں مجھے گھورتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ میری تنہائی اور گھر کی خموشی' سرگوشی بن جاتی تھی اور اس کی بازگشت ہر سمت سے پکارتی تھی کہ موت میرے گرد اپنا حصار تنگ کر رہی ہے۔

ہر لمحے یہ محسوس ہوتا تھا کہ دشمن کہیں آس پاس ہی چھپا ہوا ہے۔

میں چھٹی والے دن صدر گھاٹ سے کشتی میں زنجیرہ جانے کے لئے ٹرمینل پر پہنچا اتفاق سے اس وقت کوئی کشتی زنجیرہ نہیں جارہی تھی کیونکہ پانی میں سورج کی تپش کی وجہ سے بڑی طغیانی تھی موجیں بپھری ہوئی تھیں لیکن لانچوں اور سٹیمروں کی آمدورفت جاری تھی ایسی صورت میں کشتی میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لئے میں لانچ پر سوار ہو گیا اور عرشہ پر ریلنگ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میری پشت پر دس بارہ مسافر کھڑے ہوئے تھے' بمشکل دس بارہ منٹ کا سفر تھا' میں قدرتی مناظر دیکھنے میں محو ہو گیا۔ جس وقت کشتی بوڑھی گنگا کے درمیان میں سے گزر رہی تھی مجھے اچانک کسی نے پیچھے سے ایسا زبردست دھکا دیا کہ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ میں پانی میں جا گرا جب میں غوطہ مار کر ابھرا تو میں نے عرشے پر اس لڑکی کی جھلک دیکھی جو مجھے رمنا گرین پارک میں ملی تھی۔ اس کے ساتھ وہی آدمی کھڑا تھا جسے میں اس کے ہمراہ سینما ہاؤس میں دیکھ چکا تھا' لانچ تیزی سے جارہی تھی اس لئے فوراً رک نہ سکی۔ البتہ مخالف سمت سے آتی ہوئی بڑی کشتی میرے پاس آکر رک گئی تھی اس کے ملاح اور مسافروں نے مجھے سہارا دے کر کشتی میں سوار کرایا۔

میں نے اس رات بہت سوچ بچار کیا کہ آخر میرا کون دشمن ہے جو میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے جبکہ میں ایک معمولی آدمی ہوں' دفتر میں میری کسی سے بھی کوئی چپقلش نہیں تھی' نہ ہی میں کسی کی ترقی میں رکاوٹ تھا۔ نہ میرے پاس کوئی ایسا بڑا عہدہ تھا کہ مجھے مار کر کوئی خود اس عہدے پر قبضہ کرنا چاہتا ہے مگر میں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مخمصے کو حل کرنے کے لئے کس کی مدد لوں؟ اس شیطانی چکر نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا مگر میں نے ایک دو دن کے بعد اپنے اس خوف پر قابو پا لیا تاہم میں چوکنا ہو گیا تھا' بے حد محتاط رہنے لگا تھا پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا

ایک روز مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں میری شکل کسی ایسے شخص سے تو نہیں ملتی جس سے دشمن کو انتقام لینے کی آرزو ہو گی۔

☆------☆------☆

میں نے چونک کر زیب النساء کی طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھا وہ میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کو بڑی تیزی سے سمیٹ کر الماری کی درازوں میں رکھتی جا رہی تھی۔ میرے اندر جیسے تیز ہوائیں سنسنانے لگیں مجھے اپنی سماعت پر فتور کا احساس ہوا میں اپنی جگہ جامد و ساکت تھا اور میرے وجود میں کتنی ہی دیر تک سناٹا چھایا رہا اس کی پیشکش اس قدر غیر متوقع اور چونکا دینے والی تھی کہ میں اس خوش نصیبی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

زیب النساء اس فرم میں ایک کلیدی حیثیت رکھتی تھی۔ مجھ سے اچھے لوگ یہاں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ میں نے شاید ہی کبھی زیب النساء کو ان لوگوں میں یا کسی میں دلچسپی لیتے ہوئے دیکھا ہو وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی جانب بھی پیش قدمی کرتی تو وہ اپنی قسمت پر نازاں ہو جاتا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ دفتر کے بہت سارے مرد اس پر ریشہ خطمی ہیں۔ یہ وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی لیکن اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی جبکہ میں ایک معمولی سا ملازم تھا میرے اور اس کے درمیان ایک طبقاتی دیوار حائل تھی جسے میں کسی بھی صورت میں گرا نہیں سکتا تھا لیکن اس نے صرف ایک لمحے میں یہ دیوار مسمار کر دی تھی۔

تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور میرے روبرو آ کر کھڑی ہو گئی تھی اس نے دلکش انداز میں پرس میری نظروں کے سامنے لہرا کے میری آنکھوں میں جھانکا تھا۔ "آپ کو دو میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہو گا۔"

"دو چیزیں..........." میں اس کی بات کا مطلب بالکل نہیں سمجھا تھا۔

"چابیاں یا زیب النساء؟" وہ میرے مسکرانے سے پہلے ہی کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی۔

میں نے دل میں یہ سوچا کہ اس سے کہوں کہ مجھے دونوں چیزیں درکار ہیں لیکن دل کی بات زبان پر لانے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ "چابیاں دے دیں۔"

میں تجوری کی چابیاں روزانہ دفتر کی چھٹی سے ذرا پہلے اس کے حوالے کر کے جاتا تھا۔ کچھ دن پیشتر دوسری منزل پر واقع ایک دفتر میں چوری کی واردات ہوئی تھی' چور نے الماری کا تالا توڑ کر اس میں سے سیف کی چابیاں نکال کر اس میں جھاڑو پھیر دی تھی۔ لہٰذا آج یہ طے پایا تھا کہ میں تجوری کی چابیاں اپنے ساتھ گھر لے جایا کروں گا اور صبح اپنے ساتھ لے آؤں گا۔

"چلئے میں آپ کو اچھی سی چائے پلاؤں؟" اس نے مجھے چائے پینے کی دعوت دی' تو مجھے اس بات کا یقین نہیں آیا۔

وہ اپنے کمرے سے نکلی تو میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ بلند قامت اور حسین عورت تھی۔ وہ سفید ساڑھی میں ملبوس راج ہنس کی طرح گردن اونچی کئے چل رہی تھی۔ اس کی چال میں وقار تھا تمکنت تھی' دفتر کے مرد اور عورتوں نے مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھا' نہ جانے کتنے اندر ہی اندر سے جل کر رہ گئے تھے۔ زیب النساء نے آج تک دفتر کے کسی مرد کو اس قابل نہیں جانا تھا' یہ اعزاز آج صرف مجھے ملا تھا۔

اس کی سرخ رنگ کی بے حد آرام دہ کار کی گداز سیٹ پر میں اس کے پہلو میں بیٹھا تھا تو خوشبوؤں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایک مدہوش کن خوشبو تھی جو اس کے سراپا سے اٹھ کر میرے گرد لہرے لینے لگی تھی۔ میرا وجود جیسے اس خوشبو میں کہیں گم ہو کر رہ گیا تھا' ہم دونوں ایک اعلیٰ درجے کے ریستوران کے نیم تاریک گوشے میں جا بیٹھے۔ زیب النساء نے چائے کے ساتھ بہت ساری چیزوں کا آرڈر بھی دے دیا۔

گرم گرم چائے کی چسکیوں کے درمیان وہ میری سابقہ ملازمت کے بارے میں سوالات کرتی رہی۔ معلوم نہیں کیوں وہ میری ذات میں اس قدر دلچسپی لے رہی تھی'

آج میں نہ جانے کیسے اس کی نظروں میں اس قدر اہم ہو گیا تھا۔ اس کا رم جھم لہجہ پھوار بن کر مجھ پر برستا رہا۔ میں اس کی مدھر آواز میں ڈوبتا چلا گیا' میں نے پہلی مرتبہ زیب النساء کے انداز میں اس قدر والہانہ پن اور وارفتگی محسوس کی تھی۔ اس کی مست انکھڑیوں نے میرے سینے میں خوابیدہ امنگوں کو جگا دیا تھا۔

جب ہم ریستوران سے باہر آئے تو شام کا دھندلکا رات کی سیاہی میں تحلیل ہو چکا تھا' یہ شام کیسی حسین سی لگ رہی تھی' اس نے اپنی گاڑی کے پاس رک کر مجھ سے پوچھا۔ "آپ گھر جا رہے ہیں یا کہیں اور؟"

"گھر۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے آوارہ گردی ذرا بھی پسند نہیں۔"

"آپ کیسے جائیں گے؟"

"بس یا رکشا سے چلا جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "پیدل بھی جا سکتا ہوں' میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"چلئے میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں اس طرح آپ کا گھر بھی دیکھ لوں گی۔"

میں نے رسمی طور پر ذرا تکلف سے کام لیا لیکن اس کے اصرار پر اس کی یہ پیشکش قبول کر لی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ کم از کم اس طرح مزید کچھ لمحات اس قیامت کے قرب میں گزارے جا سکتے تھے' میں اس سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔

میں نے زیب النساء کو اپنے گھر کا پتہ بتا دیا تھا مگر نمک بازار کے علاقے سے گزرتے ہوئے اس نے یکایک اپنی گاڑی کا رخ ایک سنسان لمبی اور تپلی سی گلی میں موڑ دیا۔ یہ راستہ میرے گھر کو نہیں جاتا تھا۔

"یہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "یہ آپ غلط راستے پر آ گئی ہیں۔"

"یہ سمجھئے کہ آپ کو اغوا کر کے لئے جا رہی ہوں۔" وہ شوخی سے یوں ہنس پڑی۔ اس کے گداز ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "یہ بھی ایک حسین اتفاق ہے کہ ادھر

سے گزرتے وقت میرا غریب خانہ پہلے آ گیا' گھر کا راستہ دیکھ کر مجھے فوراً یاد آیا کہ میرا چھوٹا بھائی آج صبح چٹاگانگ سے لوٹتے ہوئے تازہ روپ چندا مچھلی لے کر آیا تھا۔ میری چھوٹی بہن شیبا' مچھلی اس قدر لذیذ بناتی ہے کہ آپ نے شاید ہی کبھی ایسی فرائی مچھلی کھائی ہو گی' دال اور بھات کے ساتھ اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔" چند منٹوں کے توقف کے بعد اس نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔ "مجھے امید ہے کہ آپ رات کا کھانا میرے ساتھ کھاتے ہوئے کوئی تکلف محسوس نہیں کریں گے۔"

زیب النساء زہر کھلانے کے لئے مدعو کرتی تو میں بہ خوشی اس کی دعوت قبول کر لیتا۔ میں نے ذرا بھی تامل نہیں کیا بلکہ کسی قدر بے تکلفی سے اپنا اشتیاق ظاہر کیا' ایسا مرد جو ہوٹلوں اور اپنے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کا ذائقہ زبان سے زہر کی طرح محسوس کرتا ہو وہ گھر میں پکائے ہوئے کھانوں سے کیسے منہ موڑ سکتا ہے۔

زیب النساء نے کھانے کی میز پر خود تو بہت کم کھایا مگر مجھے بڑے چاؤ اور اصرار سے کھلاتی رہی۔ میں نے اس کی طرف جتنی مرتبہ بھی دیکھا' اتنی ہی بار یہ سوچا کہ زیب النساء آج مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہو رہی ہے اگر اسے میری وجاہت نے متاثر کیا ہے تو اسے بہت پہلے میری طرف پیش قدمی کرنا چاہئے تھی' آج آخر کیا ہوا؟

کھانے سے فراغت کے بعد اس کی چھوٹی بہن شیبا نے میرے لئے تازہ لیموں کا شربت بنایا۔ زیب النساء نے اپنے لئے چائے بنوائی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک اس کے گھر کے خوشگوار ماحول میں بیٹھا لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ سب لوگ مجھ سے اس طرح بے تکلف ہو گئے تھے جیسے میں اس گھر کا ایک فرد ہوں۔ رات کے گیارہ بجے ان لوگوں نے مجھے جانے کی اجازت دی۔ میرے انکار کے باوجود زیب النساء کا چھوٹا بھائی مجھے اپنی کار میں گھر تک پہنچانے آیا تھا۔

کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے جب میں بستر پر لیٹا تو احساس ہوا کہ عورت کے بغیر گھر کس قدر سُونا سُونا سا لگتا ہے اور زندگی بھی کتنی بے رنگ و بے کیف اور ادھوری محسوس

ہوتی ہے۔ آج مجھے اپنی زندگی میں بہت بڑا خلاء سامحسوس ہو رہا تھا۔ میں زیب النساء کے بارے میں سوچنے لگا اس کا قرب کس قدر خوشگوار ثابت ہوا تھا۔ اس کا والہانہ انداز اس کا شوخ لہجہ' دل کو گرما دینے والی دلکش مسکراہٹ سب کچھ عجیب سالگ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے مجھے غنودگی طاری ہونے لگی' خواب میں بھی میں زیب النساء کے سنگ ان دیکھے نخلستانوں اور رنگ برنگ پھلواریوں کی سیر کرتا رہا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو دن خاصا نکل آیا تھا۔ مجھے نو بجے دفتر پہنچنا ہوتا تھا یہ میری زندگی کا شاید پہلا اتفاق تھا کہ جو اس قدر دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ میرے سارے وجود پر ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا جس نے مجھے جلد بیدار ہونے نہیں دیا۔ میں نے سوچا کہ آج دفتر گول کر دوں اور زیب النساء کا سندر سپنا دیکھتا رہوں لیکن جیسے ہی مجھے چابیوں کا خیال آیا میرا نشہ ہرن ہو گیا۔ میں جلدی جلدی تیار ہوا اور جب میں بھاگم بھاگ دفتر پہنچا تو گیارہ بج چکے تھے۔

دفتر میں قدم رکھتے ہی مجھے وہاں کی فضا کچھ بدلی بدلی سی نظر آئی' دفتر کے بیرونی دروازے پر پولیس کے چند سپاہیوں کو مستعد دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ دفتر کے لوگ آپس میں چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں کر رہے تھے' لڑکیاں سہمی اور گھبرائی ہوئی سی تھیں' میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔

میرے دریافت کرنے پر دفتر کے ایک شخص نے بتایا کہ رات کے وقت کسی نامعلوم چور نے چوکیدار کو شدید زخمی کر دیا ہے اس کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا ہے جہاں اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں' یہ ابھی تک نہیں معلوم ہو سکا کہ اسے کس چیز کی ضرب سے بے ہوش کیا گیا ہے۔

ایک انجانے خوف سے میرا دل دھڑک اٹھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تجوری کھولنا آسان نہیں ہے اور اس کی چابیاں میرے پاس ہیں پھر بھی میں نے سراسیمہ ہو پوچھا کیا دفتر میں چوری ہوئی ہے؟

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "یہاں سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ دفتر والوں نے اچھی طرح سے اطمینان کر لیا ہے۔"

"پھر چور کس لئے آیا تھا؟"

اس شخص نے لاعلمی کے انداز میں اپنے کاندھے اچکائے۔ "ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ کوئی چیز نہ لگ سکی ہو اور وہ نامراد واپس چلا گیا ہو۔"

میں اپنے کمرے میں پہنچ کر سانس بھی لینے نہیں پایا تھا کہ باس کی سیکرٹری مس شوبھا نے مجھے انٹرکام پر باس کا یہ حکم سنایا کہ میں پانچ لاکھ کی رقم لے کر فوراً باس کے پاس پہنچوں۔ معاملہ چونکہ طے نہیں ہو سکا ہے اس لئے وہ پارٹی رقم واپس لینے آئی ہے اور بڑی دیر سے میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔

میں نے جیسے ہی چابیاں نکال کر تجوری کھولی دوسرے ہی لمحے میں آنکھیں دھندلا سی گئیں اور دل کی دھڑکنیں یک لخت رک گئیں' میں سناٹے کے عالم میں اپنی جگہ اس طرح سے منجمد ہو گیا جیسے کوئی بجلی آ گری ہو۔ میں نے اپنی آنکھیں مسل کر اپنے سامنے چھائی ہوئی دھند مٹانے کی کوشش کی' تجوری خالی تھی اور میرا منہ چڑا رہی تھی۔ چرمی بیگ کے ساتھ ساتھ دفتر کی دس ہزار کی رقم بھی غائب تھی۔ صرف ضروری کاغذات اپنی جگہ موجود تھے۔

پھر میرا سر تیزی سے چکرانے لگا کمرے کی ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ رفتہ رفتہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو باس کے کمرے میں صوفے پر لیٹا ہوا پایا۔ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ تاہم حیرت کی بات یہ تھی کہ میں اس قدر مضبوط اعصاب کا مالک بے ہوش کیسے ہو گیا تھا۔

کمرے میں میرے علاوہ چار افراد اور تھے۔ سب سے پہلے میری نظر باس اور زیب النساء پر پڑی باس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری اور سپاٹ نظر آ رہا تھا لیکن زیب

النساء کسی قدر فکرمند اور مضطرب دکھائی دی۔ اس کے چہرے کی شادابیاں ماند پڑ گئی تھیں اور آنکھوں کے چراغ بجھے بجھے سے نظر آ رہے تھے۔ اسے تردد کا شکار دیکھ کر میرے دل پر چوٹ سی لگی میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر تیسرے شخص کی طرف دیکھا یہی وہ شخص تھا جو کل پانچ لاکھ روپے لے کر آیا تھا اور آج وہ رقم مجھ پر ایک عذاب بن کر نازل ہو گئی تھی۔ میں گردن تک دلدل میں پھنس چکا تھا۔ وہ شخص کمرے میں موجود لوگوں میں سب سے زیادہ مضطرب اور ہونق دکھائی دیا۔ چوتھا چہرہ میرے لئے قطعی اجنبی تھا اس کی وردی اس کے پیشے کو متعارف کرا رہی تھی وہ پولیس انسپکٹر تھا اس کے چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں سختی جھلک رہی تھی۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ تیزی سے لپک کر میری طرف بڑھا باقی تینوں بھی اس کی تقلید میں میری جانب دوڑ پڑے۔ میں ان لوگوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا' کچھ دیر پہلے کا واقعہ یاد آتے ہی خوف کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔

پولیس انسپکٹر کسی قدر بے رحم اور سفاک شخص دکھائی دیتا تھا' اس نے نہایت جارحانہ انداز سے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی جیسے میں کوئی خطرناک ترین مجرم ہوں اس کی زبان سے نکلتا ہوا ایک ایک لفظ دو دھاری تلوار کی طرح میرے سینے میں اتر رہا تھا۔ اگر وہ میرے بدن پر بے دردی سے کوڑے برساتا تو شاید مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس کے سوالات سے ہو رہی تھی۔ مجھے ان سب کی نظروں میں ذلیل کیا جا رہا تھا تاہم میں نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور اس کے ہر سوال کا جواب تسلی بخش انداز میں جواب دینے کی کوشش کی لیکن وہ میرے کسی جواب جیسے مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے چند لمحات کے توقف کے بعد تیکھے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "دیکھئے مسٹر! آپ فوج میں ایک اہم افسر رہ چکے ہیں' آپ کے باس نہیں چاہتے کہ یہ واقعہ پولیس کیس بن جائے' میں اس ضمن میں صرف اس لئے رعایت دے رہا ہوں کہ فوج کا تقدس مجروح نہ ہو۔ عوام اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر کس قسم کی رائے قائم کریں گے

آپ اس بات کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ساری شہادتیں آپ کے خلاف جا رہی ہیں اور وہ سب کی سب اس قدر ٹھوس ہیں کہ آپ اپنے جرم سے دامن بچا نہیں سکتے۔ آپ کے باس اور مس زیب النساء اس امر کے گواہ ہیں اور آپ بھی یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ تجوری کی چابیاں آپ کے پاس موجود تھیں۔ دفتر پہنچ کر آپ نے تجوری دیکھی کھولی تو وہ اسی طرح مقفل تھی۔ چوکیدار نے ہوش میں آ کر یہ بیان دیا ہے کہ رات کے وقت آپ دفتر کے عقبی حصے سے داخل ہوئے اور بیرونی دروازے سے چرمی بیگ لے کر نکل رہے تھے کہ اس کا آپ کا آمنا سامنا ہو گیا' آپ نے اسے دیکھتے ہی اس پر حملہ کر دیا۔ اپنی دانست میں تو آپ نے چوکیدار کو قتل کر دیا تھا لیکن قدرت نے اسے بچا لیا۔ یہ دوسرا سنگین جرم ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان تمام شواہد کے باوجود آپ کو ایک شرط پر معاف کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا اس مردود چوکیدار نے میرے خلاف قطعاً جھوٹا بیان دیا تھا۔ میں نے مردہ لہجے میں پوچھا۔ "کس شرط پر؟"

"آپ وہ رقم واپس کر دیں۔" اس نے تند نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

میرے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا' میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے پاس وہ رقم کہاں سے آ سکتی ہے؟ جبکہ میں نے چوری نہیں کی۔"

"آپ انتہائی ڈھٹائی سے ان ساری شہادتوں کو جھٹلا رہے ہیں؟ بڑے افسوس اور شرم کی بات ہے۔" پولیس انسپکٹر نے مجھے ملامت سے کہا۔ "چوکیدار کا بیان.........."

"چوکیدار کا بیان سراسر بکواس ہے۔ مجھ پر بہتان ہے۔" میں نے چلا کر کہا۔

"چیخنے چلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا مسٹر!" انسپکٹر نے تلخی سے کہا۔ "آپ قانون کی نظروں میں مجرم بن چکے ہیں۔ چوکیدار اس واقعہ کا عینی گواہ ہے۔ آپ اس کے

بیان کو کسی بھی عدالت میں جھٹلا نہیں سکتے اور نہ ہی جیل جانے سے بچ سکتے ہیں۔"

"یہ میرے خلاف کوئی گھناؤنی سازش معلوم ہوتی ہے۔" مجھے اپنی آواز ویران کھوکھلی اور بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

اس وقت زیب النساء نے جھرجھراتی آواز میں پولیس انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ "کیوں نہ آپ ان کے گھر کی تلاشی لے لیں۔"

پولیس انسپکٹر نے پل بھر کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلایا۔ "آپ کہتی ہیں تو چل کر ان کے گھر کی تلاشی لے لیتا ہوں لیکن کوئی احمق شخص بھی اتنی بڑی رقم چرانے کے بعد اپنے گھر میں چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔"

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "کیا ہم آپ کے گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں؟" اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں .... چلئے۔"

میں ان چاروں کو اپنے ہمراہ لے کر گھر پہنچا' انسپکٹر نے ان سب کے سامنے میرے گھر کی تلاشی لینا شروع کی' میرے کمرے میں سامان ہی کیا تھا۔ میں تو ایک مسافر کی طرح رہ رہا تھا' تلاشی کے دوران میرا سوٹ کیس بھی کھلوایا گیا اور اس میں وہ چرمی بیگ بر آمد ہوا جس میں پانچ لاکھ کی رقم کے علاوہ دفتر کی دس ہزار کی رقم بھی موجود تھی۔

میں پھٹی پھٹی نظروں سے اس رقم کو دیکھنے لگا' میرا دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا تھا۔ مجھے جیسے دلدل میں دھکا دے گیا تھا۔ اب میرے پاس اس دلدل سے نکلنے کے لئے تنکے کا سہارا بھی نہیں تھا۔

پھر مجھے قانونی گرفت سے اس طرح نجات ملی کہ ان لوگوں کے کہنے پر میں نے ایک ایسی تحریر لکھ کر دے دی جو میرے لئے کسی وقت بھی پھانسی کا پھندا ثابت ہو سکتی تھی' اس تحریر سے میں کسی بھی لمحے قانون کی گرفت میں آ سکتا تھا لیکن یہ مجبوری تھی۔

اس کے علاوہ میرے لئے چھٹکارے کا کوئی اور راستہ بھی تو نہیں تھا۔

☆------☆------☆

اس دن اور پھر رات بھر سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو گیا لیکن میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آ سکا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ کسی نے میرے خلاف سازش کر کے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا تھا لیکن مجھے پھنسا کر آخر اسے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔ میں دفتر کے کسی شخص کی راہ میں رکاوٹ بھی نہیں بنا تھا کسی کو مجھ سے ایسی کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جس پر شک کر سکتا۔ جس کسی نے بھی مجھے پھنسانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے بے انتہا ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ شخص چاہتا تو ساری رقم ہڑپ کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ تو صرف مجھے ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ میرے دامن پر رسوائی اور بدنامی کا داغ لگانا چاہتا تھا لیکن آخر کیوں؟ اس سے اس کا کیا مقصد تھا وہ کیا حاصل کرنا چاہتا تھا؟

سوچتے سوچتے میرا دماغ چکرا گیا۔ بے شمار سوالات تھے جو میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے لیکن میرے پاس کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں گھپ اندھیرے میں کھڑا تھا۔

میں کئی دنوں تک اس جانکاہ صدمے سے اس قدر دل گرفتہ رہا کہ کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ مجھے باہر نکل کر کرنا بھی کیا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں میرا کوئی دوست' مونس اور غم خوار نہیں تھا' گنتی کے چند شناسا لوگ تھے جن سے میرے تعلقات رسمی سے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی میرا درد دل بانٹ نہیں سکتا تھا کوئی میرے دامن سے بدنامی کا داغ دھو نہیں سکتا تھا' ان دنوں بستر پر لیٹے لیٹے چھت گھورتا رہتا' آپ ہی آپ باتیں کرنے لگ جاتا۔ میرے ذہن میں اس واقعے سے جو شبہات ابھرتے رہتے ان پر گھنٹوں غور کرتا' میں ان تمام کڑیوں کو ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش کرتا جن کا کوئی سرا ہی نہیں تھا۔

تھک ہار کر میں زیب النساء کے بارے میں سوچنے لگتا' اس کا تراشیدہ پیکر میرے تصورات میں لہراتا تو دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہوتا' میں نے کئی بار سوچا کہ زیب النساء سے ایک بار مل لینا چاہئے۔ اس سے مل کر صفائی پیش کرنا چاہئے۔ ممکن ہے اس کے دل میں میرے لئے ہمدردی کے جذبات موجزن ہوں۔ شاید اسے میری بے گناہی کا یقین ہو میں دکھ سے یہ سوچ کر رہ جاتا کہ حالات نے میرے ساتھ کس قدر سنگین مذاق کیا ہے۔ زیب النساء اس واقعے سے ایک دن پہلے ہی میری جانب مائل ہوئی تھی اس کی قربت نے مجھے عجیب سے احساسات میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں زندگی کے اس رخ کی طرف دیکھنے لگا تھا جو اب تک میری نظروں سے اوجھل رہا تھا لیکن دوسرا ہی دن میری زندگی میں تاریکی لئے طلوع ہوا اور میرا سب کچھ اس میں کھو کر رہ گیا۔

☆------☆------☆

ایک ہفتے کے بعد میں نہ چاہتے ہوئے بھی زیب النساء کے گھر جا پہنچا۔ میں اسے اپنی بے گناہی کا یقین دلانا چاہتا تھا اس طرح میرے اعصاب ہلکے پھلکے ہو جاتے وہ ایک ذہین' سمجھدار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت تھی اس کی غمگساری میرے دل سے پھانس نکال سکتی تھی' مجھے جینے کا حوصلہ دے سکتی تھی' لیکن مجھے دیکھتے ہی اس کی شہابی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں' اس کا حسین چہرہ نفرت سے سکڑ گیا۔ اس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں چنگاریاں سی بھڑکنے لگیں اس کا ایک ایک لفظ میرے دل میں زہریلا تیر بن کر اتر گیا۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر رکھائی سے پیش آئے گی۔ اس نے مجھے کچھ بولنے اور صفائی پیش کرنے کا موقع تک نہیں دیا تھا' میرا دل اندر سے ٹوٹ کر کسی کانچ کی طرح ریزہ ریزہ ہو گیا۔ جب میں شکستہ دل اور نامراد لوٹنے لگا تو اس نے سخت لہجے میں تنبیہہ کی۔ "آپ آئندہ اپنی شکل دکھانے کی زحمت نہ کریں۔"

ایک ہفتہ اور گزر گیا' آہستہ آہستہ میں ذہنی طور پر نارمل ہوتا گیا۔ تنگ دستی اور فکرِ معاش نے زیب النساء کا خیال دل سے کافی حد تک دور کر دیا تھا۔ اب مجھے دوبارہ زندگی

کے جہنم میں جدوجہد اور مشقت کرنا تھی۔ پنشن کی رقم سے گزارہ کیوں کر ہوتا اور پس انداز کی ہوئی رقم کب تک چلتی؟ میں نے دو تین بڑے اخبارات میں خالی آسامیوں کے اشتہارات دیکھے اور تین دن میں کوئی پندرہ بیس درخواستیں لکھ کر ارسال کر دیں اور کچھ دفاتر کے چکر بھی کاٹے۔ ایک دن شام کے وقت مجھے اس قدر وحشت محسوس ہوئی کہ میں اپنی پسندیدہ اداکارہ کیوری کی فلم کا آخری شو دیکھنے نیو مارکیٹ چلا گیا۔ بلاکا سینما میں کئی ہفتوں سے یہ فلم چل رہی تھی۔ جب میں فلم دیکھ کر لوٹا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ گلیاں سنسان اور ویران پڑی تھیں' چاروں طرف ایک گہرا سناٹا طاری تھا' میں رنگن سٹریٹ کے نکڑ پر پہنچا تھا کہ عقب سے کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی' میں نے پلٹ کر دیکھا سٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی میں ایک نسوانی ہیولا وحشت زدہ انداز میں میری سمت دوڑتا چلا آ رہا تھا' میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میری رگوں میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی' وہ بھاگتے بھاگتے پیچھے کی طرف بار بار دیکھتی جا رہی تھی' اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔

میرے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رکی' وہ ایک نوجوان اور پر کشش لڑکی تھی۔ اس کے چہرے سے دہشت اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا تھا اس نے میرا سر تا پا جائزہ لیا اور میرے قریب پہنچ کر میرا شانہ تھام لیا۔

"خدا کے لئے .... آپ مجھے بچا لیں۔" اس نے پھولی ہوئی سانس کے درمیان کہا۔ "بدمعاش میرے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں۔"

"کون لوگ ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"میں انہیں نہیں جانتی۔" اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ "جلدی سے بھاگ چلئے۔ مجھے کہیں چھپا دیجئے۔"

"ڈرو نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "وہ تعداد میں کتنے ہیں؟"

"چار ہیں۔" اس نے خوف زدہ نظروں سے پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے کانپتی آواز میں جواب دیا۔ "ان چاروں کے پاس چاقو بھی ہیں۔"

میرے بدن میں خون کی گردش تیز ہو گئی یہ لمحہ ایسا تھا کہ میں اس لڑکی سے مزید پوچھ گچھ نہیں کر سکتا تھا وہ اس قدر دہشت زدہ اور ہراساں نظر آ رہی تھی کہ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں نے اسے ہر قیمت پر بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس لمحے میں نے بہت دور سے کئی آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں سنیں جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھیں۔

میں نے لڑکی کا مرتعش ہاتھ پکڑا اور منی سٹریٹ کی طرف اسے لے کر لپکا۔ آوازیں اب برابر کی گلی سے آ رہی تھیں۔

دفعتاً گہری خاموشی چھا گئی اور پھر اس سناٹے میں ایک بھاری آواز گونجی۔ "لڑکی .... ادھر .... منی سٹریٹ کی طرف گئی ہو گی۔"

لڑکی کے منہ سے بے ساختہ سی چیخ نکل گئی۔ خطرہ ہمارے سروں پر موت بن کر منڈلانے لگا تھا۔ اگر ایک دو بدمعاش ہوتے تو میں آسانی سے ان سے نمٹ سکتا تھا لیکن لڑکی نے بتایا کہ وہ تعداد میں چار ہیں اور مسلح بھی ہیں۔ میں نہتا شخص ان چاروں بدمعاشوں سے بیک وقت کس طرح نبرد آزما ہو سکتا تھا۔ میں لڑکی کو تقریباً گھسیٹتا ہوا ایک بنگلے کی طرف بڑھا۔ بنگلہ ڈاکٹر چوہدری کا تھا جو اپنی بیوی اور بوڑھی ساس کے ساتھ رہتے تھے۔ بنگلے کا گیٹ بوسیدہ حالت میں کھلا پڑا تھا۔ میں لڑکی کو لئے ہوئے تیزی کے ساتھ بنگلے کے احاطے میں گھس گیا۔

پورا بنگلہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن یہ تاریکی ہمارے لئے معاون ثابت ہو رہی تھی، ہم دونوں چوروں کی طرح دبے پاؤں عقبی حصے میں آ گئے۔ لڑکی مجھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی پھولی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ پڑوس کے کسی بنگلے کی منزل سے ہلکی ہلکی روشنی یہاں تک پہنچ رہی تھی، میں نے اپنی ساری توجہ اور اپنے کان سڑک کی طرف لگا دیئے۔ چند لمحات بھی نہیں گزرے تھے کہ بہت سے قدموں کی آوازیں ابھریں اور وہ لوگ بنگلے کے بیرونی دروازے کے پاس آ کر رک گئے تھے۔

"آخر وہ گئی کہاں؟" ایک کرخت آواز گہرے سناٹے میں گونجی۔

"کسی گھر میں تو نہیں گھس گئی؟" دوسری آواز نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"اتنی جلدی وہ کس کے گھر میں پناہ لے سکتی ہے۔" ایک تیسری آواز نے سرگوشی کی۔ "شاید وہ کسی اور گلی میں چلی گئی ہے۔"

"کہیں وہ اس بنگلے میں تو نہیں چھپ گئی؟" چوتھی آواز نے اپنا شک ظاہر کیا۔ "کیوں نہ ہم اس کی تلاشی لے لیں۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" کرخت لہجے نے تائید کے انداز میں کہا۔

لڑکی کے بدن پر جیسے بجلی سی گر گئی وہ دہشت زدہ ہو کر میری پیٹھ سے چپک گئی تھی۔ اس کا پورا بدن دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا، میں خطرہ محسوس کرتے ہی نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگا جس سے اپنا دفاع کر سکوں اور لڑکی کو بھی ان بدمعاشوں سے محفوظ رکھ سکوں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے ایک ڈنڈا پڑا دکھائی دیا۔ میرے بدن میں فرحت کی سی لہر دوڑ گئی۔ میں نے سرعت سے وہ ڈنڈا اٹھایا اور ساتھ ہی ایک بڑا پتھر اٹھا کر لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"کوئی بدمعاش اس طرف آئے تو تم بلا جھجک اس کے سر پر پتھر دے مارنا۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

لڑکی کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ اس کے ہاتھ میں پتھر کانپنے لگا۔ خوف کی شدت سے وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ "گھبراؤ نہیں۔ میں ان بدمعاشوں سے اب تنہا بھی نمٹ سکتا ہوں، بس تم صرف ایک کی خبر لے لینا باقیوں کو میں سنبھال لوں گا۔"

صرف ایک بدمعاش بنگلے کے احاطے میں داخل ہوا تھا۔ اس کی آہٹوں سے اندازہ ہوا کہ وہ عقبی حصے کی طرف کسی قدر آہستگی سے آ رہا ہے۔ میں نے سینے میں سانس روک کر ڈنڈے پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی اور متوقع حملے کے انتظار میں چوکنا ہو

گیا۔

اچانک ہی کسی کمرے میں کھٹ پٹ کی آواز گونجی اور احاطے کے ایک گوشے میں روشنی پھیل گئی۔ شاید کوئی کھڑکی کھولی گئی تھی۔ اس بدمعاش کے قدموں کی آواز یک لخت بند ہوگئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ بیرونی گیٹ کی طرف لپکا اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

"کون ہے؟" ڈاکٹر چوہدری کی مانوس آواز سناٹے میں گونجی۔ "کون ہے بھئی؟"

اس آواز کے جواب میں وہ لوگ تیز تیز قدموں سے جانے کس سمت چل پڑے تھے۔ چند ثانیوں کے بعد کھڑکی ہلکے سے شور کے ساتھ بند ہوگئی۔ دوبارہ وہی اندھیرا اور سکون طاری ہوگیا۔ تاہم میں نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔ میں خطرہ ٹل جانے کا اچھی طرح سے یقین کرلینا چاہتا تھا۔ کیونکہ ان بدمعاشوں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ باہر کہیں چھپ کر انتظار بھی کرسکتے تھے۔

خاصی دیر گزر جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ میں نے گردن گھما کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی تھی۔ میں نے اس کے قریب ہو کر اسے ہدایت دی کہ وہ دبے پاؤں میرے ساتھ آئے' لڑکی نے اپنے سینے اور شانے پر ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پھر میرا ہاتھ تھام لیا۔

ہم چند ثانیوں میں سڑک پر پہنچ گئے تھے۔ میں اسے اپنے ہمراہ لے کر وائر سٹریٹ کی طرف بڑھا جہاں میری قیامگاہ تھی۔ یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں اس کے گھر کا پتہ دریافت کرتا اور اسے لے جا کر اس کے گھر چھوڑ دیتا۔

اچانک ہی بہت دور سے کئی آدمیوں کے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ خطرہ ہمارے سروں پر دوبارہ منڈلانے لگا تھا۔ ہم دونوں تیز تیز قدموں سے چلنے لگے۔ چند لمحے بعد ہم وائر سٹریٹ پر آگئے۔ گھر پہنچ کر میں نے تالا کھولا اور لڑکی کو ساتھ لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوگیا۔ لڑکی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ میں نے اندر سے

دروازہ بند کیا اور زیرو پاور کا نائٹ بلب روشن کردیا۔ ٹیوب لائٹ روشن کرکے میں کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ بدمعاش میرے کمرے میں اتنی رات گئے روشنی دیکھ کر مشکوک ہوسکتے تھے۔

زیرو پاور کے بلب کی روشنی اس قدر تیز تھی کہ میں لڑکی کا سراپا واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ وہ متناسب بدن اور جاذب نظر نقوش کی مالک تھی لیکن اس کے چہرے پر جو علامات نمایاں تھیں اس سے میرے لئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ مشکوک کردار کی لڑکی ہے۔ مجھے اس لمحے ہلکا سا تاسف ہوا۔ ایسے ویسے کردار کی لڑکی کا بدمعاشوں سے بھی تعلق ہوسکتا تھا۔ ایک انجانے خوف کا احساس میری ریڑھ کی ہڈی کو چھو گیا۔ اس کی یہاں موجودگی میرے لئے رسوائی کا سبب بن سکتی تھی۔ میں نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ اس لڑکی سے جتنی جلدی چھٹکارا حاصل کرلیا جائے اسی قدر میرے حق میں بہتر رہے گا۔

لڑکی کا لباس بڑی حد تک بے ترتیب سا نظر آیا لیکن اسے اپنا ہوش ہی کہاں تھا۔ وہ میرے کمرے کے وسط میں کھڑی ہوئی کسی قدر بے نیازی سے ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہی تھی۔ میرا کمرہ ایسا آراستہ بھی نہیں تھا کہ کسی کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ یہ ایک سادہ سا کمرہ تھا' اس میں کسی قسم کی کوئی تزئین و آرائش نہیں تھی۔

میں نے قیاس کیا کہ وہ بے مقصد کمرے کے در و دیوار کو تک رہی ہے جیسے اس کا مقصد محض وقت گزاری ہو۔ کتنے ہی لمحات گزر گئے۔ میں نے اسے اس قدر مطمئن پاکر متعجب نظروں سے دیکھا۔ اس پر کسی قسم کا خوف و ہراس طاری نہیں تھا۔

"تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "جلدی سے سارا قصہ سناؤ تاکہ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔"

اس نے میری طرف پلٹ کر مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔ ایک انجانا احساس اس کی آنکھوں میں ابھرنے لگا۔ اس کے ہونٹ سکڑنے کے انداز میں کھلے مگر کسی خیال کے تحت اس نے اپنی مسکراہٹ کو منجمد کردیا۔

وہ بولی تو اس کے لہجے میں خوف کا ذرا سا بھی شائبہ محسوس نہیں ہوا۔

"میں ابھی آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں' پہلے اپنا لباس ٹھیک کرلوں۔"

اس نے میرے کچھ کہنے سے پیشتر ساڑھی کا پلو شانے سے الگ کیا اور اب وہ صرف پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں دوسری طرف منہ پھیر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی اس بے باک اور عامیانہ حرکت پر میرے دل میں نفرت سی پیدا ہوئی۔ اس میں کسی قسم کا حجاب بھی نہیں تھا۔ گویا میرا اندازہ اس کے بارے میں درست ہی تھا۔

اسی پل میں نے اپنے کمرے کے آس پاس بہت سے قدموں کا شور سنا۔ دوسرے ہی لمحے دروازے پر مسلسل دستک ہونے لگی۔ میں گھبرا سا گیا اور میں نے پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم ابھر کے پھیل گیا۔ اس کی آنکھیں کسی احساس کی شوخی سے چمکنے لگیں۔ میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میں نے بدحواس ہو کر مرتعش آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

"دروازہ کھولو۔" ایک مانوس آواز ابھری یہ آواز زین العابدین کی تھی جو اسی محلے میں رہتے تھے اور ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر تھے۔

میں ان کی آواز سن کر حیران بھی ہوا اور کسی قدر سراسیمہ بھی۔ اتنی رات گئے ان کا آنا خالی از علت نہیں تھا۔ ان کے ساتھ اور بھی لوگ تھے جن کی آوازوں کی بھنبھناہٹ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ میں نے سٹپٹا کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ دستک تھی کہ مسلسل ہوئے جارہی تھی۔ مجھے دروازہ کھولنے کے سوا کوئی اور صورت نظر نہیں آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

سب سے پہلے میری نظر زین العابدین پر پڑی' مجھے دیکھ کر ان کا منہ نفرت سے گیا۔ ان کے ساتھ محلے کے ایک بزرگ اور دو آدمی اور بھی تھے جن کے چہرے میر۔ لئے اجنبی تھے۔ وہ سب دندناتے ہوئے میرے کمرے میں گھس آئے۔ ایک شخص

فوراً ہی اندر سے دروازہ بند کردیا۔

ان سب کی نظریں اس لڑکی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں مگر لڑکی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا وہ اسی طرح بے حجابانہ انداز میں کھڑی رہی۔

زین العابدین صاحب نے لڑکی کو ایک نظر دیکھنے کے بعد پلٹ کر میری طرف خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں جو سوال تھا اس نے مجھے بری طرح بوکھلا دیا۔ انہوں نے کرخت لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ میں ان سے کہتا بھی کیا؟ لڑکی جس عالم میں کھڑی تھی اس نے میرے کردار کو ان لوگوں کی نظروں میں مشکوک کر دیا تھا۔ میں سکتے کی سی حالت میں کھڑا رہا۔

محلے کے بزرگ مجھے گم صم پاکر مخاطب ہوئے۔ "آپ کو اس محلے میں یہ کمرہ اس لئے کرائے پر دیا گیا تھا کہ شریفوں کی طرح رہیں گے۔ اس محلے میں بہو بیٹیاں اور جوان لڑکے رہتے ہیں۔ آپ جیسے ذمے دار آدمی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ بدکار عورتوں کو اپنے ہاں لے کر آئیں۔"

یہ ایک ایسا الزام تھا کہ میں تلملا کر رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے سینے پر گرم گرم سلاخ داغ دی ہو۔ نیکی کا صلہ مجھے ذلت اور رسوائی کی صورت میں مل رہا تھا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے مختصر الفاظ میں انہیں ساری کہانی سنادی۔

ان لوگوں کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں میرے ایک لفظ پر بھی اعتبار نہیں آیا ہے۔ زین العابدین پھر سے پولیس انسپکٹر بن گئے۔ انہوں نے مجھ پر بے رحمانہ لہجے اور سخت الفاظ میں جرح شروع کردی۔ میں نے ان کے تمام سوالات کے صحیح صحیح جوابات دیئے مگر انہیں پھر بھی یقین نہیں آیا۔ انہوں نے لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ "کیا یہ سارے واقعات درست ہیں؟"

"جی نہیں۔" لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ساری کہانی من گھڑت ہے۔ یہ

صاحب مجھے دو سو ٹاکا کے عوض یہاں لے کر آئے ہیں اور میں یہاں پہلی بار نہیں آئی ہوں' کئی بار آ چکی ہوں۔"

میں لڑکی کی زبان سے اس قدر سفید جھوٹ اور بہتان سن کر سناٹے میں آ گیا۔ دوسرے لمحے میری رگوں میں خون ابلنے لگا۔ میں غضب ناک انداز میں لڑکی کی طرف جھپٹا مگر اس نے دوڑ کر ان لوگوں کے درمیان پناہ لے لی۔

پھر میرے ساتھ وہی کچھ پیش آیا جو میں نہیں چاہتا تھا اور میرے لئے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ سب سے پہلے اس لڑکی کو نکال دیا گیا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے بڑی دیر تک میرے کردار پر نشتر آمیز رائے زنی کی۔ مجھ پر لعنت ملامت کی گئی۔ میں اس واقعے میں کچھ اس طرح ملوث ہو گیا تھا کہ کسی صورت میں انہیں اپنی بے گناہی یقین نہیں دلا سکتا تھا۔

میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان کے ہر حکم کی تعمیل کروں۔ اس نتیجے میں مجھے ایک تحریر دینا پڑی جس میں' میں نے اپنی بدکاری کا اعتراف کرتے ہوئے آئندہ ایک شریف آدمی کی طرح اس محلے میں رہنے کا عہد کیا تھا۔

زین العابدین صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اس واقعے کا کسی سے تذکرہ نہیں جائے گا لیکن مجھے بھی اپنی اس تحریر کا پاس کرنا ہو گا۔ میں اگر دوبارہ بدکاری میں ملوث گیا تو وہ مجھے فی الفور قانون کے حوالے کر دیں گے۔

ان لوگوں کے باہر نکلتے ہی میں کسی ٹوٹی شاخ کی طرح بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اپنا سر تھام لیا۔ اس ذلت اور رسوائی سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ ذہن ماؤف ہو گیا۔ طرح طرح کے خیالوں کی یورش مجھے پاگل کئے دے رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیا اب مجھے کبھی کسی کے ساتھ بھلائی نہیں کرنا چاہئے؟ خاص کر کسی عورت کے ساتھ۔

مجھے کوئی ایک ہفتے کے بعد کو میلا شہر اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے جانا

لیکن میں نے اس وقت یہ فیصلہ کیا کہ میرا نہ جانا بہتر ہے' سفر میں نہ جانے کیا واقعہ پیش آئے۔ میں ایک مرتبہ پھر ذہنی طور پر بری طرح الجھ گیا تھا۔ گو یہ دوسرا واقعہ کسی قدر مختلف نوعیت کا تھا لیکن میرا دل اس شہر سے اچاٹ ہو کر رہ گیا۔ قسمت نے میرے ساتھ عجیب کھیل کھیلا تھا آخر یہ سارے واقعات کس لئے پیش آ رہے ہیں؟ کون کٹھ پتلی کا کھیل کھیل رہا ہے؟ کس کے ہاتھ میں اس کی ڈوریاں ہیں؟ میں کرب' دکھ اور غصے سے سوچتا اور اپنا دل مسوس کر رہ جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ اپنے نادیدہ دشمن کو کہاں اور کیسے تلاش کروں؟

مجھے چھ سات دنوں کے بعد دو تین جگہ سے انٹرویو کے لئے طلب کیا گیا۔ ایک فرم نے اپنے طور پر کیشیئر کی ملازمت کی پیشکش کی لیکن میں نے توبہ کر لی تھی کہ آئندہ کبھی ایسی ملازمت نہیں کروں گا۔ میں ایک دن کریسنٹ ٹیکسٹائل ملز میں سیکورٹی آفیسر کے عہدے کے لئے انٹرویو دینے پہنچا' انٹرویو بے حد کامیاب رہا اور تیسرے دن مجھے اس کمپنی کی جانب سے تقرر نامہ موصول ہو گیا۔

کریسنٹ ٹیکسٹائل ملز میں یہ میرا پہلا دن تھا۔ میں اپنا تقرر نامہ لے کر رسمی کارروائی کے طور پر ڈائریکٹر کے کمرے میں حاضری دینے پہنچا۔ ڈائریکٹر اس وقت ٹیلیفون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کی آواز کی لرزش بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس آیا اور ریسیور ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ اس کا چہرہ زرد پڑتا چلا گیا۔ اسے سراسیمگی کے عالم میں دیکھ کر مجھے کسی قدر حیرانی ہوئی اور اس پر ترس بھی آیا۔ اس ڈائریکٹر نے میرا انٹرویو لیا تھا اور تقرر نامہ اس کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔

جب اس نے اپنی گفتگو ختم کر کے ریسیور کریڈل پر رکھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور پھر اس کا چہرہ متغیر ہونے

میں نے اسے حواس باختہ دیکھ کر اس سے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "سر خیریت تو ہے؟ آپ بڑے پریشان نظر آرہے ہیں۔"

ڈائریکٹر نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اس نے مجھ پر خوفزدہ سی نظر ڈالی اور جیب سے رومال نکال کر چہرے کا پسینہ پونچھنے لگا۔ پسینہ پونچھنے کے بعد اس نے دوبارہ ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک بھاری بھر بٹوا موجود تھا۔ اس نے سو سو ٹاکا کے پانچ نوٹ نکالے اور میری جانب بڑھا دیئے۔ اس کے ہاتھ ابھی تک لرز رہے تھے۔

میں نے حیرت بھری نظریں ان نوٹوں پر مرکوز کردیں اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم اس رقم کو اپنی ایک دن کی تنخواہ سمجھ کر رکھ لو۔" اس نے مرتعش آواز کہا۔

"میں آپ سے تنخواہ لینے نہیں آیا ہوں۔" میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور اپنا تقررنامہ اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ "میں آج ہی اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو ہوں۔"

اس نے نوٹ میرے آگے ڈال دیئے۔ "تم یہ رقم لے کر یہاں سے ابھی اور اسی وقت رخصت ہو جاؤ اور آئندہ یہاں مت آنا۔ ہمیں تمہاری خدمات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"مگر کیوں؟" میں نے تحیر زدہ ہو کر پوچھا۔ اس کی اس بات نے مجھے بری طرح چکرا دیا تھا۔

اس کے چہرے کی زردی خشونت میں بدل گئی۔ اس نے لرزاں آواز میں مری سے جواب دیا۔ "میں نے کہہ دیا نا کہ ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے پاس کیوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔"

میرا ذہن یکبار جھنجھنا اٹھا میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ یہاں میرے ساتھ ذلت آمیز سلوک کس لئے کیا جارہا ہے؟ اس ایک ماہ میں میرے ساتھ جتنے بھی واقعات پیش آئے تھے ان میں میری اہانت کے پہلو تھے۔ میں ہر جگہ رسوا ہوا تھا۔ اب ایک مرتبہ پھر میری ذات کا وقار مجروح کیا جارہا تھا۔ اس قدر سنگین مذاق کرنے کی آخر کیا ضرورت تھی؟ اگر ملازمت نہیں دینی تھی تو پہلے ہی صاف طور پر انکار کر دیا جاتا۔ مجھے تقررنامہ ارسال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

میں نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا اور مردہ سی آواز میں بولا۔ "صاف صاف بتائیں۔ آپ مجھے ملازمت دے کر انکاری کیوں ہو رہے ہیں؟ کیا یہ میرے ساتھ مذاق نہیں ہے؟"

"زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ یکایک شیر ہو گیا اور اس نے مجھے شعلگیں نظروں سے گھورتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "بس یہ میرا حکم ہے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اسی وقت کمرے سے نکل جاؤ۔"

"آخر کیوں؟" میں بگڑ کر وحشیانہ انداز سے چیخا۔ پھر میں غصے کی حالت میں کانپتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی کرسی کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔ میری نس نس میں لاوا ابلنے لگا تھا۔ "مجھے اس کی وجہ بتاؤ......... ورنہ میں تمہیں بخشوں گا نہیں۔"

وہ میری اس غیر متوقع دھمکی پر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ہکلایا۔ "مم......... میں......... کچھ نہیں جانتا۔ بس ایک حکم ہے میں اس کی تعمیل کر رہا ہوں۔"

"کس کا حکم ہے؟" میرا سخت لہجہ کمرے میں گونجا۔ "مجھے بے وقوف بنانے کی ضرورت نہیں۔"

اس پر سراسیمگی طاری ہونے لگی۔ اس نے سٹپٹا کر دہشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "میں کچھ بتا نہیں سکتا۔"

اس کے انکار نے مجھ پر جنون طاری کر دیا۔ پھر میں نے کسی نتیجے کی پرواہ کئے بغیر جھک کر سفاکی سے اس کے کوٹ کا کالر پکڑ لیا اور اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ "اگر تم نے اس شخص کے بارے میں نہیں بتایا تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔" میں نے دھمکی آمیز میں کہا۔

اسے شاید توقع نہیں تھی کہ میں اس کے ساتھ اس قدر درندگی سے پیش آؤں گا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے مجھے دہشت زدہ نظروں سے دیکھا پھر مرتعش آواز بولا۔ "ایک منٹ صبر کرو......... میں ابھی بتاتا ہوں۔ میرا کالر چھوڑ دو۔"

میں نے اس کے کوٹ کے کالر پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور بے تابانہ نظروں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس نے اپنا کوٹ درست کرتے اور بدحواسی پر قابو پاتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر کہا "میں اس شخص کو ذاتی طور پر بالکل نہیں جانتا نہ ہی میں اس کے نام اور پتے سے واقف ہوں۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے اس کا ٹیلیفون آیا تھا۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ میں آج ہی بلکہ اسی وقت تمہیں ملازمت سے نکال دوں اور اس کے عوض ایک پیسہ بھی نہ کروں لیکن میں پھر بھی تمہیں پانچ سو ٹاکا دے رہا ہوں' تم اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کرو گے۔" اس کی آواز اٹکنے لگی۔

"مگر جب تم اس شخص سے واقف نہیں ہو تو پھر اس کے حکم کی تعمیل کس لئے رہے ہو؟" میں نے اس کی طرف مشتبہ انداز سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم مجھ جھوٹ نہیں بول رہے ہو؟"

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "حکم عدولی کی صورت میں مجھے اپنی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ میری جوان اور اکلوتی بیٹی اس وقت اس کے پاس یر ہے۔ اس نے ٹیلیفون پر مجھے میری بیٹی کی آواز سنائی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔"

میں سناٹے میں آ گیا اور مجھ پر سکتے کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ آخر وہ کون

تھا؟ میں نے چکراتے ہوئے سوچا۔ اسے مجھ سے کیا دشمنی تھی؟ وہ میری ملازمت کے درپے کیوں ہو رہا ہے؟ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ گو میرے ذہن میں کئی بار یہ خیال آیا کہ پس پردہ وہ میرا کوئی دشمن ہے لیکن میں نے اسے دوسری طرف واہمہ بھی تصور کیا تھا' کیونکہ بظاہر اس کی کوئی بنیادی وجہ نہیں تھی۔ میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے ہیں وہ محض اتفاقات بھی ہو سکتے ہیں۔ دشمنی اس وقت کی جاتی ہے جب کسی کے پاس دولت ہو یا کوئی وراثت کا معاملہ ہو یا پھر کوئی ایسا عہدہ جو کسی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بن رہا ہو۔ میرے ساتھ ایسی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ ایسا کوئی معاملہ سرے سے ہی موجود نہیں تھا۔ پھر آخر یہ دشمن کہاں سے نکل آیا؟

میں نے اس سے دریافت کیا۔ "آخر اس شخص کو میرے ساتھ کیا دشمنی ہے؟"

"تم خود ہی بہتر سمجھ سکتے ہو؟" اس نے مردہ لہجے میں جواب دیا۔

میں نے فوج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈھاکہ شہر میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس شہر میں ملازمت کر کے اپنی تنہا زندگی آسانی سے گزار لوں گا۔ میں اب اپنے گاؤں جانا نہیں چاہتا تھا۔ گاؤں میں میرے لئے رکھا ہی کیا تھا۔ میرے ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ دنیا میں میرا کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا۔ میں نے پالنڈ ایک دوست کی بیٹی کی شادی پر خرچ کر دیا تھا۔ اس دوست نے ہندوستانی سرحد پر مورچوں میں میری جان بچائی تھی جس کے نتیجے میں وہ خود ایک بازو سے محروم ہو گیا تھا۔

ڈھاکہ جیسے شہر میں ایک ریٹائرڈ فوجی کے لئے زندگی گزارنا اس قدر آسان نہیں تھا جتنا کہ میں نے اپنے تئیں فرض کر لیا تھا۔ یہاں مکانوں کے کرائے انتہائی زیادہ تھے۔ مہنگائی کا عفریت آدمی کو نگلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ایک غریب کے لئے ایک وقت کی روٹی کھانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے گزر اوقات کے لئے اپنی ملازمت کا آغاز کیا لیکن اس وہ دشمن کے ہاتھوں قدم قدم پر ذلیل و خوار ہوتا آ رہا تھا۔

میں نے اپنے دشمن کے بارے میں بہت سوچا اور کئی دنوں تک نفرت غصے اور

جذباتی انداز سے سوچتا رہا مگر میری یادداشت میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جسے میں
دشمن تصور کرتا۔ فوج میں بھی میرا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اپنی رجمنٹ میں
ہردلعزیزی کا اعتراف کمانڈر بھی کیا کرتے تھے' میرے تمام کے تمام ساتھی گہرے
مخلص دوست تھے۔ وہ لوگ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے اپنے گاؤں جا کر آباد ہو گئے تھے
مجھے بھی اپنا گاؤں بے حد یاد آتا لیکن وہاں زندگی گزارنے کی کوئی سبیل بھی نہیں تھی۔

میرا ذہن اس بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا کہ اس نے میرا چین وسکون اور رات
نیندیں حرام کر دی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرا انجانا دشمن کون ہے
مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ اگر وہ میری موت کا خواہاں ہے تو مجھے آسانی سے ختم کر سکتا
ڈھاکہ جیسے شہر میں کسی کی زندگی کا خاتمہ کرنا ایسا مشکل نہیں تھا۔ یہاں ایسے پیشہ
قاتل بھی تھے جو سو ٹاکا میں کسی کو بھی موت کی نیند سلا سکتے تھے۔

میری الجھن کسی طرح دور نہیں ہو رہی تھی۔ ان دنوں میں بے حد پریشان
پریشانی کے عالم میں' میں بازاروں اور گلیوں میں نکل جاتا اور بے مقصد اِدھر اُدھر گھو
رہتا۔ گھر مجھے کاٹنے کو دوڑتا تھا اور در و دیوار سے وحشت ٹپکتی تھی۔ ایک نامعلو
خوف بھی محسوس ہوتا تھا۔ میں اس عرصے میں بیسیوں جگہ ملازمت کے لئے درخواست
ارسال کر چکا تھا لیکن کہیں سے مجھے جواب نہیں آیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میرا
میرے خلاف سرگرم عمل ہے۔

☆------☆------☆

ایک دن میں یونہی آوارہ گردی کر کے رات گئے گھر لوٹا اور پھر کمرے میں
کرتے ہی اپنی جگہ سے اُچھل پڑا جیسے کسی نے میری پشت میں خنجر گھونپ دیا ہو
حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

میرے بستر پر خون میں لت پت ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کی پیٹھ میں
دستے تک پیوست تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یقیناً غش کھا کر گر جاتا مگر میں

اپنے حواس کو قابو میں رکھا۔ میں ایک سپاہی تھا اور میدان جنگ میں بے شمار خون
خرابے سے گزر چکا تھا۔ تاہم اس کے باوجود میں نے اپنی رگوں میں دہشت کی لہر سنسناتی
ہوئی محسوس کی۔ میرے حلق میں گرہیں پڑنے لگیں۔ میں کتنے ہی لمحات تک بے حس و
حرکت کھڑا لاش کو تکتا رہا۔

لاش منہ کے بل پڑی تھی اس لئے مقتول کا چہرہ ٹھیک سے نظر نہیں آ سکا۔ جس
حد تک چہرہ نظر آ رہا تھا اس سے مجھے کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کون ہے' اچانک ہی ایک
خیال میرے ذہن میں جھٹکا بن کر لگا۔ یقیناً یہ ساری حرکت میرے انجانے دشمن کی
تھی۔ اس نے مجھ پر ایک ایسی ضرب لگائی تھی کہ اب میری جان بچنا بہت مشکل تھا۔
میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

میں راہِ فرار اختیار کر کے مزید مشکلات میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ میں آخر کب
تک خود کو پولیس کے ہاتھوں سے بچا سکتا تھا لیکن میں بے گناہ تھا۔ یہ سوچ کر میری
خاصی ہمت بندھی۔ میں اپنے حواس مجتمع کر کے آہستہ آہستہ پلنگ کی طرف بڑھا۔ میں
مقتول کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے سیدھا کرنے میں دشواری یہ تھی کہ چاقو اس کی
پیٹھ میں اترا ہوا تھا۔ چاقو نکالے بغیر لاش کو کسی بھی صورت میں سیدھا نہیں کیا جا سکتا
تھا۔

میں پلنگ کے بالکل قریب پہنچ گیا میں نے چاقو کے دستے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دفعتاً
میری آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ ایک پل کے لئے پورا کمرہ تیز روشنی میں نہا گیا تھا۔ میں
نے گھبرا کر چاقو سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور کئی ثانیوں تک حواس باختہ پلکیں جھپکاتا رہا۔ اسی
وقت باہر گلی میں کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی اور پھر سارا معاملہ میری سمجھ میں آ
گیا۔ میرے دشمن نے ایسے عالم میں میری تصویر اتار لی تھی کہ اسے دیکھ کر ہر کوئی مجھے
قاتل تسلیم کر لیتا۔ اس ثبوت کو کسی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا مجھے اپنی حماقت کا فوراً
ہی شدید احساس ہوا۔ وہ تصویر میرے لئے پھانسی کا پھندا بن سکتی تھی۔

میں نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر باہر جھانکا۔ گلی کے آخری سرے پر ایک شخص بھاگتا ہوا نظر آیا۔ آج مجھے میرا دشمن نظر آیا تھا اور میرے لئے یہ موقع تھا کہ میں اسے قیمت پر پکڑلوں۔ اسے جانے نہ دوں۔ اس خیال سے میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلا اور گلی میں اسی سمت بھاگنے لگا۔ چہار اطراف تاریکی چھائی ہوئی تھی بھاگتے بھاگتے میں ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گرا مگر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور چوٹ کی پرواہ کئے بغیر دوبارہ دوڑنے لگا۔ مجھے ہر قیمت پر اس شخص کو پکڑنا تھا تاکہ اس سے کیمرہ اور تصو حاصل کرسکوں۔ وہ شخص بھی اندھادھند دوڑ رہا تھا ایک موڑ پر وہ نظروں سے اوجھل گیا لیکن اس کے جوتوں کی آواز سنائی دی۔ تقریباً سو گز کے فاصلے پر وہ جگہ تھی جہاں اس کے جوتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی میں نے اپنی رفتار کم نہیں کی بلکہ میں نے رفتار اور تیز کرتے ہوئے جلد ہی وہ موڑ طے کرلیا۔

میرے اور اس کے درمیان کوئی نصف فرلانگ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ اس کے دوڑنے کی رفتار میرے مقابلے میں بہت تیز تھی کیونکہ وہ دبلے پتلے جسم کا تھا اور لمبے قد کا بھی تھا۔ وہ اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے چار سو گز کی دوڑ جیتنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اچانک سکوٹر کے سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ تقریباً سو گز کے فاصلے روشنی پھیل گئی۔ میرا دشمن بھاگتا ہوا ایک سکوٹر پر سوار ہوا جس پر پہلے ہی سے ایک شخص موجود تھا۔ دوسرے لمحے سکوٹر فراٹے بھرتا ہوا میری مخالف سمت تیز رفتاری روانہ ہوگیا۔

میں دوڑتے دوڑتے رک گیا اور کسی قدر بے بسی سے سکوٹر کو جاتے ہوئے رہا۔ حتیٰ کہ وہ بائیں ہاتھ کی ایک گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا اور میں کف افسوس ملنے لگا۔

یہ بات تو صاف ظاہر تھی کہ سکوٹر پر پہلے سے موجود شخص میرے دشمن کا ساتھی تھا اور سکوٹر لئے ہوئے اسی کا انتظار کر رہا تھا مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ آخر اسے

اتنی دور کھڑے ہونے کی کیا ضرورت تھی وہ چاہتا تو میرے گھر کے قریب بھی اپنے ساتھی کا انتظار کرسکتا تھا۔ اس طرح اسے کسی ممکنہ خطرے سے واسطہ بھی نہیں پڑسکتا تھا۔

میں تھکے تھکے قدموں سے گھر کی جانب واپس ہوا۔ مجھے جیسے کسی نے بری طرح نچوڑ کر رکھ دیا ہو۔ فی الحال اس سے بھی سنگین مسئلہ میرے سامنے تھا۔ میرے کمرے میں ایک لاش پڑی ہوئی تھی میں دنیا والوں اور قانون کی نظروں میں قاتل بن چکا تھا بار بار میری آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا لہرانے لگتا۔ ہرچند کہ میں بے گناہ تھا لیکن میری سنتا کون؟ کون شخص میری بے گناہی کا یقین کرتا۔ میرے خلاف قدم قدم پر ٹھوس ثبوت موجود تھے۔

میرے سینے میں نفرت اور انتقام کی آگ دہکنے لگی۔ میں دکھ اور افسوس سے ہاتھ ملنے لگا کہ ایک موقع دشمن کو پکڑنے کا ملا بھی لیکن میں اس میں بری طرح ناکام رہا۔ میرے دل کے گوشے میں ایک اذیتناک احساس کسی نیزے کی انی کی طرح چبھنے لگا۔ میں نے کبھی میدانِ جنگ میں شکست کی ذلت نہیں اٹھائی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک سپاہی شکست سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے؟

لیکن اس وقت مجھ پر جو کیفیت طاری تھی وہ شاید کسی شکست خوردہ سپاہی پر طاری نہیں ہوئی ہوگی۔

دشمن نے مجھ پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ اس نے میرے وجود کو پارہ پارہ کردیا تھا میں جس قدر سوچتا دماغ اتنا ہی الجھتا۔ میں نے اپنے کمرے کی چوکھٹ پر دونوں ہاتھ رکھ کے سر ٹکا دیا اور غم سے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے دانستہ لاش کی جانب دیکھنے سے احتراز کیا تھا۔ نہ جانے میں کب تک اسی عالم میں ذہنی کشمکش سے دوچار ہوتا رہا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب مجھے کون سا قدم اٹھانا چاہئے۔ بڑی دیر کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال آسکا کہ پہلے بالائی منزل پر مقیم کرائے داروں کو اس حادثے

کی اطلاع دوں۔ اس کے بعد زین العابدین سے رجوع کروں۔ تیسرا مرحلہ پولیس کو مطلع کرنے کا تھا اس مرحلے میں میرے ساتھ کیا کچھ پیش آئے گا۔ میں اس سے بے خبر نہیں تھا مجھ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑنے کا جواز موجود تھا۔ میں حالات کا سامنا کرنے کے لئے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔

☆———☆———☆
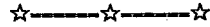
میں نے ایستادہ ہو کر کمرے میں جھانکا اور پھر بستر پر نظر پڑتے ہی میرا منہ حیرت سے ططارہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کوئی انتہائی بھیانک راب دیکھا ہو بستر خالی پڑا تھا میں سرعت سے پلنگ کے پاس پہنچا۔ بستر پر گہرے نیلے نگ کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ چادر پر بے شمار شکنیں نظر آ رہی تھیں مگر خون کا ایک ھبہ تک نہ تھا۔

حیرت کے اس جھٹکے نے مجھے کسی قدر بے حواس کر دیا تھا۔ میں دھم سے بستر پر گرا اور کافی دیر تک بے جان لاش کی مانند لیٹا رہا مگر میرا ذہن برابر سوچنے میں لگا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ میرے ذہن کے گوشوں سے دھند چھٹنے لگی مجھے اپنے دشمن سے شدید لرت ہو چکی تھی لیکن میں دل ہی دل میں اس کی ذہانت پر عش عش کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ سکوٹر کس لئے اس قدر دور کھڑا کیا گیا تھا۔ واضح طور پر دشمن کا لصد یہی تھا کہ جب میں اس کے تعاقب میں نکلوں تو اس اثنا میں لاش کو غائب کر دیا جائے۔

اچانک ہی ایک اور خیال میرے ذہن میں سرسرایا ممکن ہے کہ سرے سے کوئی لاش ہی نہ ہو بلکہ اس سارے ڈرامے میں ایک جیتے جاگتے شخص نے لاش کا کردار ادا کیا ہو مجھے یاد آیا کہ اس وقت میرے بستر پر گہرے سرخ رنگ کی دری بچھی ہوئی تھی یقینی طور پر دشمن کا مقصد یہی رہا ہو گا کہ خون کے دھبے میری چادر پر لگنے نہ پائیں۔ آہستہ آہستہ میرا یہ خیال یقین میں بدلتا گیا اس ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے کسی

پرندے کا خون اور سپرنگ والا نقلی چاقو استعمال کیا گیا تھا جس کا پھل دباؤ پڑنے سے میں چلا جاتا تھا۔

میں کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر میرے دشمن کا منصو کیا ہے؟ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے اور کس لئے میرے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کر ہے؟ اگر اسے مجھ سے واقعی کوئی دشمنی ہے تو کھل کر مقابلے پر کیوں نہیں آتا ہے۔

ایک شبہ یہ بھی میرے ذہن میں پیدا ہوا کہ ممکن ہے کوئی غیر ملکی ایجنٹ فوجی حاصل کرنے کے چکر میں مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے مگر میں نے جلد ہی اس خیال ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ میں فوج میں ایک معمولی سا افسر تھا اور میں اسے کس سے اہم راز فراہم کر سکتا تھا اگر اس نے مجھ سے ایسی کوئی توقع وابستہ کر بھی رکھی تھی یہ سراسر اس کی خلل دماغی کا ثبوت تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک سبکدوش فوجی افسر اس لئے کسی طرح بھی کار آمد ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

انہی خیالوں میں الجھتے الجھتے نہ جانے کس وقت مجھے نیند آگئی جب میری آنکھ کھلی تو محسوس ہوا کہ دروازے پر کوئی آہستہ آہستہ اور وقفے وقفے سے دستک دے رہا ہے۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی کھڑکی کی راہ سے نظر آیا تو احساس ہوا کہ دن خاصا چڑھ آیا ہے۔ میں نے اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھ دس بجنے والے تھے چونکہ رات کے آخری پہر سویا تھا اس لئے جلد بیدار نہ ہو سکا تھا میں ہڑبڑا کے بستر سے نکلا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

لحظہ بھر کے لئے میری آنکھوں میں روشنیاں سی اتر آئیں میرے سامنے ایک دلکش لڑکی کا سراپا لہرا رہا تھا۔ سفید ساڑھی نے اس کی سانولی رنگت کو نکھار کر مزی فروزاں کر دیا تھا وہ اس سفید لباس میں لپٹی ہوئی جنت سے چرائے ہوئے کسی پھول طرح لگ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی حسین آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ ستارہ آنکھیں میں نے بہت کم دیکھی تھیں۔ اس نے اپنی سحر طراز آنکھیں میری

آنکھوں میں ڈال دیں۔ جب وہ بولی تو ایسا لگا کہ جیسے چاروں طرف جل ترنگ بج اٹھے ہوں۔ "کیا آپ کیپٹن محمد صبور احمد ہیں؟"

میں اس اجنبی لڑکی کی زبان سے اپنا نام سن کر ایک دم چونک اٹھا تھا۔ میں نے متعجب ہو کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ایک لمحے کہ میرے دل میں خیال آیا کہ شاید دشمن نے مجھے پھانسنے کے لئے پھر کوئی نیا جال بچھایا ہے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ رات کے حادثے نے مجھے اس طرح سے بے بس کر دیا تھا کہ دشمن مجھے کسی بھی دن قانون کے حوالے کر کے پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتا تھا اور اب صبح ہوتے ہی ایک اور مصیبت میرے گھر کی دہلیز پر کھڑی ہوئی تھی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا پھر مجھے اپنی وہ تحریر یاد آئی جو میں نے زین العابدین کو لکھ کر دی تھی۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں؟" لڑکی نے نفیس لب و لہجے میں پوچھا۔

لڑکی بظاہر کسی قدر شائستہ مزاج کی دکھائی دے رہی تھی لیکن اسے میں اندر آنے کی اجازت دے کر کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے زین العابدین سے زبانی طور پر وعدہ کیا تھا کہ آئندہ کسی عورت کو اپنے ہاں نہیں بلاؤں گا۔ اگر موصوف اسے دیکھ لیتے تو یقیناً میری شامت آسکتی تھی۔ میں عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ لڑکی نے میرے جواب کا انتظار کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ وہ میرے قریب سے گزرتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی اس کے کھلے ہوئے سیاہ بالوں کی مہک میرے مشام جان کو معطر کر گئی۔ میرے سارے وجود میں عطر بیز ہوائیں چلنے لگیں۔ مجھے بے اختیار گاؤں کے بھولے بسرے دن یاد آگئے۔ میرے سینے میں خوابیدہ تمنائیں مچلنے لگیں۔

میرا کمرہ کسی قدر بے ترتیب ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لڑکی کو بٹھاؤں یا رخصت کر دوں۔ میرے کمرے میں جو کرسی تھی اس لڑکی کے لائق بھی نہیں تھی۔ اس نے کمرے کا سرسری انداز سے ناقدانہ سا جائزہ لیا اور کسی قدر اطمینان سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے نیلو کہتے ہیں۔" وہ میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرائی اور اس نے مترنم لہجے میں کہا۔ "میں آپ کے لئے ایک پیغام لائی ہوں..........."

وہ اپنا سیاہ چرمی پرس کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے لگی مجھ پر ابھی تک بے خودی سی چھائی ہوئی تھی اس کے سراپا سے پھوٹنے والی خوشبو نے پورا کمرہ مہکا دیا تھا میں اپنی جگہ منجمد سا ہو کر اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔

اس نے چند لمحوں کی تلاش کے بعد پرس میں سے ایک پرزہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کے خوبصورت 'نازک اور سڈول ہاتھ سے وہ پرزہ لے کر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس پر ایک نظر ڈالی۔ پرزے پر کسی شخص کا نام درج نہیں تھا البتہ ایک گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیا یہ گھر کا پتا ہے؟"

"جی ہاں۔" وہ اپنا خوشنما سر ہلا کر بولی۔ "یہ پتا ادریس الحق صاحب کا ہے۔ انہوں نے آپ کو شام پانچ بجے چائے پر مدعو کیا ہے۔"

"یہ ادریس الحق صاحب کون بزرگ ہیں؟" میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"کیا آپ انہیں نہیں جانتے؟" اس نے کسی قدر حیرانی سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

"جی نہیں۔" میں نے نفی کے انداز میں اپنا سر ہلایا۔ "یہ نام پہلی مرتبہ آپ کی زبان سے سن رہا ہوں۔"

"وہ بنگلہ دیش کے بہت بڑے تاجروں میں سے ایک ہیں۔"

"ہوں گے۔" میں نے بے نیازی سے اپنے شانے اچکائے۔ "میں ایک ریٹائرڈ فوجی افسر ہوں۔ مجھے تاجروں سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟ بائی دی وے ان صاحب نے مجھے کس لئے بلایا ہے؟"

"ملازمت کے سلسلے میں۔"

"ملازمت؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "میں نے ان کے ہاں کوئی درخواست تو نہیں دی ہے۔"

"آپ اپنے ذہن پر زور دے کر سوچیں۔" لڑکی مترنم لہجے میں کہنے لگی۔ "ایسٹرن انٹرنیشنل کمپنی کی جانب سے آپ کو متعدد خطوط لکھے گئے۔ اس میں تقرر نامہ بھی شامل تھا لیکن جب آپ نے ایک مرتبہ بھی رجوع نہیں کیا تو کمپنی اس نتیجے پر پہنچی کہ شاید آپ کو وہ خط نہیں ملے ہیں اس لئے اب مجھے آپ سے رابطہ قائم کرنے کو کہا گیا ہے۔"

مجھے واقعی کوئی خط نہیں ملا تھا بلکہ میری درخواستوں تک کا جواب نہیں آیا تھا اب میں سمجھ گیا کہ میرا دشمن میری ہر راہ میں رکاوٹیں ڈال رہا تھا۔ وہ میرے خط اڑا تا تھا کہ میں ملازمت سے محروم رہوں اور کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جاؤں اس طرح وہ اپنے جذبات کی تسکین کر رہا تھا۔ یہ لڑکی نہ آتی تو مجھے اس کی کبھی بھی خبر نہ ہو پاتی۔

کسی کمپنی کا مجھ میں دلچسپی لینا بھی کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ پس پردہ ضرور کوئی بات تھی جو میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ میں نے استہزائیہ انداز سے پوچھا۔ "کیا ایک بڑی فرم میرے انتظار میں سوکھ رہی ہے؟"

لڑکی میرے لہجے کی گرمی محسوس کر کے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے دانت آب دار موتیوں کے مانند چمک اٹھے۔ اس نے گنگناتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "انہیں فوجی افسروں سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ وہ اپنی فرم میں فوجیوں کو زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا چاہتے ہیں اس لئے میرے باس نے آپ میں ذاتی دلچسپی لی ہے اور مجھے آپ سے رابطہ قائم کرنے کے لئے بھیجا ہے۔"

"وجہ؟"

اس کے رخساروں پر سرخی بکھر گئی۔ وہ ہنس پڑی تھی۔ اس نے سادہ لہجے میں جواب دیا۔ "اس لئے کہ فوجی ایک سویلین کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذمے داری کا ثبوت دیتے ہیں۔ ہماری فرم میں زیادہ تر سبک دوش فوجی کام کر رہے ہیں۔ میرے باس

ڈسپلن کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔"

"لیکن آپ کے باس نے مجھے دفتر کی بجائے قیام گاہ پر کیوں طلب کیا ہے؟"

لڑکی کے حسین چہرے پر معصومیت بکھر گئی۔ وہ چند لمحوں تک سوچتی رہی پھر بولی "میں نے ان سے وجہ دریافت نہیں کی اور کر بھی کیسے سکتی تھی۔ صرف ان کے حکم تعمیل کی ہے۔ وجہ آپ خود ان سے مل کر معلوم کر لیں۔"

میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "اچھا تو میں آج شام پہنچ رہا ہوں۔

میں نے لڑکی کی باتوں سے محسوس کیا تھا کہ وجہ وہ مجھ سے چھپا رہی ہے۔ میں اسے کریدا لیکن کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ ویسے یہ لڑکی جتنی حسین و جمیل تھی اتنی ہی گہر تھی۔ پھر وہ زیادہ دیر تک رکی نہیں اور نہ ہی میں اسے روکنا چاہتا تھا۔ اس کی موجود میرے لئے خطرے کی بات تھی۔ وہ اپنی مہک چھوڑ کر چلی گئی۔ دن میں کئی مرتبہ میر۔ اس شبہے کو تقویت ملی کہ اس میں بھی انجانے دشمن کی کوئی چال ہو سکتی ہے۔ جبھی نے مجھے دفتر کی بجائے اپنی قیام گاہ پر بلایا ہے۔ دشمن سے ملنے کے اشتیاق اور آرزو دشمن کا خوف کسی حد تک کم کر دیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر نے مجھے پھانسنے کی کوئی کوشش کی تو اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

☆------☆------☆

ادریس الحق کی وسیع و عریض کوٹھی کسی پُرشکوہ عمارت کی طرح نظر آ رہی تھی چند لمحات بعد میں ملاقاتی کمرے میں اس شخص کے روبرو بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے میں ادریس الحق کا جو خاکہ تشکیل دیا تھا وہ اس سے کہیں مختلف تھا۔ اس کی عمر پچپن برس کے لگ بھگ ہو گی۔ تاہم اس کے چھریرے بدن سے اس کی عمر کا اندازہ لگا مشکل تھا۔ بظاہر وہ تندرست و توانا نظر آتا تھا۔ اس کی گول گول آنکھوں میں عقاب سی تیزی تھی۔ اس کے چہرے پر حاکمانہ سختی چھائی ہوئی تھی۔ مجموعی طور پر اس شخصیت میں ایک رعب اور دبدبہ تھا۔ وہ کسی بھی طرح تاجر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں اس کے حاکمانہ انداز اور رعب و دبدبہ سے ذرہ برابر بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔

اس نے بغیر کسی تمہید کے اپنے مطلب کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم میرے ہاں ایسی ملازمت کرنا پسند کرو گے جو عام ملازمت سے یکسر مختلف ہو۔"

"میں ملازمت کی نوعیت معلوم کئے بغیر ہاں نہیں کر سکتا۔" میں نے حتی الامکان درشتی سے جواب دیا۔

اس نے اپنا سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں چمک بڑھنے لگی تھی۔ "میں تمہیں اس ملازمت کے بارے میں قدرے تفصیل سے بتاؤں گا۔" اس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ "یہ ملازمت لمبے عرصے کے لئے یا مختصر عرصے کے لئے بھی ہو سکتی ہے لیکن اس بات کا انحصار تم پر ہے۔ تم چاہو تو اسے ایک ہی دن میں نمٹا دو یا چاہے تو مہینوں لگا دو۔ بہرحال اس کا معاوضہ بہت بھاری ہو گا۔"

"یہ کوئی مشن ہے یا ملازمت؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"اسے ایک مشن ہی سمجھ لو۔"

"آپ مجھ سے کس قسم کی خدمت لینا چاہتے ہیں؟"

"میں پہلے تمہیں اس مشن کا معاوضہ بتا دینا چاہتا ہوں۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "تاکہ تمہیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہو اور پھر اس کی روشنی میں تمہیں کسی نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہو گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" میں نے اپنے شانے اچکائے۔

"دو لاکھ ٹاکا۔" اس نے میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ وہ شاید رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا لہجہ بے حد سپاٹ تھا۔ "ایک لاکھ ٹاکا پیشگی طور پر آج بلکہ اسی وقت ادا کر دیئے جائیں گے۔ باقی رقم مشن مکمل ہونے کے بعد..........."

"دو لاکھ ٹاکا؟"

میں اپنی جگہ چونک پڑا۔ میرے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔ یہ رقم میرے لئے بہت

بڑی تھی۔ میں اس کے حصول کا خوابوں میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا لیکن ایک
اتنی بڑی رقم کی ادائیگی میں کوئی دشواری محسوس نہیں کر رہا تھا جیسے وہ دو سو ٹاکا ہوں۔
لگ رہا تھا یہ رقم اس کے نزدیک کوڑیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس ملک
ایسے بڑے لوگ موجود تھے جن کے لئے دولت کبھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی
دوسرے لمحے میں اس شیریں تصور سے نکل آیا اور سنبھل گیا۔ میں نے اس کی طرف
مشکوک نظروں سے دیکھا اور اپنی اضطرابی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے تجسس آمیز لہجے
دریافت کیا۔ "مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

اس کے چہرے پر جو سپاٹ پن تھا وہ یک لخت مٹ گیا۔ اس کی جگہ درندگی
لے لی۔ اس نے اپنے جبڑے کسی قدر سختی سے اندر کی طرف بھینچ لئے۔ اس
آنکھیں سرخ سی ہونے لگیں۔ اس کے بشرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت
سے کھول رہا ہے۔ پھر وہ بے حد سرد و سفاک لہجے میں بولا۔ "تمہیں ایک عورت کو
کرنا ہوگا۔"

"کیا؟" میں اس طرح سے اچھل پڑا جیسے مجھے بجلی کا شاک دیا گیا ہو۔
عورت کو قتل کرنا ہے؟"

"ہاں۔" اس نے اپنی زبان سے صرف اتنا ہی کہا۔

"قتل......." میں سراسیمہ سا ہو گیا اور میری نس نس میں سنسناہٹ سی
گئی۔ "آخر آپ ایک عورت کو کس لئے قتل کرانا چاہتے ہیں؟" میری آواز
ارتعاش سا پیدا ہوا۔

"کیا تمہارے نزدیک کسی کو قتل کرنا مشکل کام ہے؟" اس کا چہرہ خوفناک ہو
"آخر اس میں اس قدر چونکنے کی کیا بات ہے؟ فوجی میدانِ جنگ میں اپنے دشمن کو گا
مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔"

"ہاں۔" میں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ "میں ایک فوجی ہوں۔ کوئی پیشہ

قاتل نہیں ہوں کہ بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتا پھروں۔ میدانِ جنگ کی
بات نہ کرو۔ وہ اور بات ہوتی ہے۔"

اس کا منہ اس طرح بن گیا جیسے کڑوا بادام کھا لیا ہو۔ "میرے نزدیک دونوں میں
کوئی فرق نہیں ہے۔"

اس کے جواب اور تکرار نے میرے تن بدن میں آگ بھر دی۔ میں نے اپنے غصے
کو ضبط کرنا چاہا مگر میرے لہجے کی تلخی چھپی نہیں رہ سکی۔ میں نے کسی قدر تند لہجے میں
کہا۔ "اگر آپ کو دونوں کا فرق معلوم نہیں ہے تو براہ کرم ایک فوجی کے سامنے اپنی
زبان بند رکھیں۔ فوجی وطن کی حفاظت کرتا ہے۔ وطن عزیز کی خاطر دشمن کیا اگر بیٹا بھی
غدار بن جائے تو اسے بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کر سکتا۔ ہمیں صرف وطن کا مفاد
عزیز ہوتا ہے جبکہ ایک قاتل محض اپنے ذاتی مفاد کے لئے قتل جیسے بھیانک جرم کا
ارتکاب کرتا ہے۔"

میرے تیز و تند اور نفرت بھرے لہجے کا اس نے کوئی اثر نہیں لیا۔ اس نے بڑی
خاموشی اور ضبط و تحمل سے میری باتوں کو سنا تھا۔ پھر اس نے نہایت ہی پُرسکون آواز میں
کہا۔ "وہ عورت بھی سفاک اور وحشی ہے۔ اس نے گاؤں والوں کی زندگی اجیرن کر رکھی
ہے۔ تم اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے اس گاؤں کے ہزاروں باشندوں پر احسان
عظیم کرو گے۔"

"اگر وہ عورت واقعی ایسی ہے تو لوگ قانون کا سہارا کیوں نہیں لیتے ہیں؟" میں
نے جھنجلا کر کہا۔

"وہ عورت نہ صرف بے حد دولت مند ہے بلکہ اس قدر اثر و رسوخ رکھتی ہے کہ
کوئی بھی اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے۔ اس علاقے میں اس کی حکمرانی
ہے۔" اس نے بتایا۔

"پھر تو یہ نیک فریضہ کوئی بھی پیشہ ور قاتل انجام دے سکتا ہے۔" میں نے طنزیہ

لہجے میں کہا۔ "ڈھاکہ شہر میں ایسے قاتلوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ ہزار دو ہزار ٹاکا میں اپنے باپ بھائی کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔"

اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "خطرناک ترین پیشہ ور قاتلوں کو اس مشن پر روانہ کیا گیا تھا مگر آج تک ان لوگوں کا نام نشان نہیں ملا۔ اب کوئی بھی وہاں کسی قیمت پر جانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جبکہ میں انہیں منہ مانگا معاوضہ دینے کے لئے بھی تیار تھا۔"

"یہ کتنے عرصے پہلے کی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی ایک سال ہوا ہو گا۔" اس نے جواب دیا۔ "اس عورت کا ظلم و ستم روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "سنئے جناب!" میں نے ادریس الحق کو مخاطب کے تقریر کے انداز میں کہا۔ "میں ایک ریٹائرڈ فوجی افسر ہوں اور اپنی بقیہ زندگی سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔ میں اس دولت کی خاطر کانٹوں پر کیسے چل سکتا ہوں جو کسی وفا نہیں کرتی۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ دولت کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ یہ ایک جانی چیز ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ "دولت ہی اس عہد کا خدا ہے۔ دولت کے بغیر زندگی میں کوئی حسن نہیں' کوئی دلکشی نہیں ہے' اس کے بغیر ہر شخص اپاہج ہے بلکہ اپاہج سے بھی بدتر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی طرف بے پروائی کے انداز سے دیکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔ "مجھے اپاہج بن کر زندگی گزارنا پسند ہے۔"

"ایک منٹ کے لئے رک جاؤ۔" اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ نے فیصلہ کرنے میں کسی قدر جلد بازی اور جذبات سے کام لیا ہے۔ میں تمہیں سوچنے کے لئے دو تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔"

"میں اپنے فیصلے پر اٹل رہوں گا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "دس لاکھ روپے میں بھی میں بکنے والا نہیں ہوں۔"

"سنو برخوردار!" اس کے لہجے کا طنز میرے لئے زہر بن گیا۔ "تم اس وقت میری مٹھی میں ہو۔ میں تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ عذاب بنا کر رکھ دوں گا۔ تمہیں کہیں سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں مل سکے گی۔ قانون کی نظروں میں تمہارا کردار داغدار ہے۔ میں جب اور جس وقت چاہوں تمہیں تختۂ دار تک پہنچا سکتا ہوں۔"

میں اس لمحے بدحواس ہو گیا لیکن میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ فوراً ہی سنبھل گیا تھا۔ تو کیا یہی شخص میرا انجانا دشمن ہے؟ میں نے دل میں سوچا۔ پھر میں نے بڑی بے پروائی کے انداز میں کہا۔ "میں ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ تم چاہو تو میری آزمائش کر لو۔"

وہ زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کمرے کے ایک گوشے کی طرف بڑھا جہاں ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ اس نے میز کی دراز میں سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ "اسے دیکھ لو۔ شاید تمہیں اپنا فیصلہ تبدیل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔"

میں نے متعجب ہو کر اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔ اس میں میرے لئے موت کا پروانہ رکھا ہوا تھا۔ اس میں ان دونوں اعتراف ناموں کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں موجود تھیں جو بلاوجہ میری زندگی پر بدنما داغ بن گئے تھے۔ تیسری چیز وہ تصویر تھی جو مجھے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتی تھی۔ تصویر اتارنے والے نے واقعی اپنے کمال کا ثبوت دیا تھا۔ اس میں مجھے نہایت بے دردی سے ایک شخص کی پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر شاید ہی کوئی میرے قاتل ہونے میں شبہ کر سکتا تھا۔

میرے پورے بدن میں نفرت اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اس کی طرف غضب ناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو تم وہی شخص ہو جو قدم قدم پر میرے لئے جال بچھا رہا تھا؟"

اس کے خشک لبوں پر تھکی تھکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "اس وقت جو چاہو سمجھ لو۔ یہ تو وقت بتائے گا کہ تمہارا دشمن کون ہے؟ بہتر ہے کہ اب ان فضول باتوں میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔ تم انکار کرنے کا انجام سمجھ ہی گئے ہو۔" اس نے لمحاتی تامل کے بعد میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا عقلمندی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ میری پیشکش قبول کرلی جائے؟"

"مگر......" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے لئے یہ راستہ بھی موت کے مترادف ہے۔"

"نہیں......یہی ایک راستہ ایسا رہ جاتا ہے جس پر چل کر تم پھانسی کے پھندے سے بچ سکتے ہو۔" اس نے سپاٹ انداز سے کہا۔ "مشن کے مکمل ہونے پر یہ تینوں داغ تمہارے دامن سے دھو دیئے جائیں گے ورنہ دوسری صورت میں......" اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"قانون اندھا ضرور ہے۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "لیکن وہ ایک بے گناہ کو ضرور تحفظ دے گا۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔" اس کے چہرے پر مکروہ ہنسی پھیل گئی۔ "ہمارے ملک میں انسانوں کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کیا جارہا ہے۔ اس قانون میں صرف ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید تمہیں نہیں معلوم کہ کتنے بے گناہ انسان اس قانون کی وجہ سے پھانسی کے پھندے تک پہنچ جاتے ہیں۔ تم بھی ان میں سے ایک ہوگے۔ ہمارے پاس صرف یہ تصویر ہی نہیں بلکہ وہ چاقو بھی موجود ہے جسے دنیا کی کسی بھی عدالت کے سامنے ایک ناقابل تردید ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس چاقو پر تمہاری انگلیوں کے نشان بھی موجود ہیں۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے تحیر زدہ ہو کر پوچھا۔ "کیا وہ چاقو نقلی نہیں تھا۔"

"یقیناً نقلی تھا۔" اس نے شگفتگی سے جواب دیا۔ "وہ قتل بھی ایک ڈرامہ تھا لیکن

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم اس لاش کو کہاں سے کھوج کر قانون کے حوالے کروگے؟ بہرحال یہ مسئلہ تو بہت بعد میں آئے گا۔ فی الوقت میں تمہیں یہ بتانے جارہا تھا کہ اس رات گیس سپرے کر کے تمہیں گہری نیند سلا دیا گیا۔ اس طرح اصلی چاقو پر تمہاری انگلیوں کے نشانات لے لئے گئے۔"

"اوہ میرے خدا۔" میرے منہ سے بے اختیار ایک طویل سانس نکل گئی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ میں اس دن اتنی دیر تک کیوں سوتا رہا تھا جبکہ میری شروع سے ہی یہ عادت تھی کہ فجر کی اذان کے وقت بیدار ہو جایا کرتا تھا چاہے رات کتنی ہی دیر تک کیوں نہ جاگتا رہوں۔ میں بے حد سنجیدگی سے اس معاملے کے عواقب پر غور کرنے لگا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو اس قدر بے بس محسوس کیا کہ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ "آپ پیشگی رقم ادا کردیں۔"

ادریس الحق کا چہرہ میرا فیصلہ سن کر دمک اٹھا۔ اس نے میز کی دراز سے ایک بڑا سا لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں ایک لاکھ کی رقم موجود ہے۔"

میں نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں سو اور پانچ سو ٹاکا کے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ میں نے لفافہ ہاتھ میں نچاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہیں اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ میں یہ رقم حاصل کرنے کے بعد کہیں بھی آسانی سے فرار ہو سکتا ہوں۔ کوئی مجھے بازیاب بھی نہیں کرسکے گا۔"

ادریس الحق معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "ہم نے تمہارے بارے میں اچھی طرح چھان بین کر کے ہی یہ مشن تمہارے سپرد کیا ہے۔ ہم نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔"

"تمہیں میری ذات پر اس قدر بھروسہ ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "تم اس مشن میں اس لئے بھی دلچسپی لو گے کہ وہ جگہ کبھی تمہارے دل کی دھڑکن رہی ہے۔"

"بہت خوب۔" میں زیر لب مسکرا دیا۔ پھر میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔

"کون سی جگہ ہے وہ؟"

"حسن پور۔"

"حسن پور!"

میں اپنے گاؤں کا نام سن کر اچھل پڑا تھا؟ آج بھی میری سانسوں میں اس گاؤں بُوباس رچی ہوئی تھی۔ میں نے جوانی کی حدود تک وہاں پُرکیف زندگی گزاری تھی۔ کبھی کبھی مجھے اپنے گاؤں کی یاد آتی تھی تو میرا دل سینے میں بری طرح دھڑکنے لگتا تھا میری بے شمار یادیں اس کے گوشے گوشے اور چپے چپے سے وابستہ تھیں۔

تاہم یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ حسن پور جیسے گاؤں میں کسی عورت کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے؟ آخر وہ کون عورت ہے جو اس گاؤں پر حکمرانی رہی ہے؟ اس نے گاؤں کے باشندوں کو کس بنیاد پر ظلم و ستم کا نشانہ بنا رکھا ہے؟' دور دراز اور پسماندہ گاؤں میں کوئی سونے کی کان بھی نہیں ہے۔ وہ ایک گمنام سا گاؤ ہے۔

مجھے اس عورت کے تذکرے میں داستان طرازی کا گمان ہونے لگا۔ اچانک اور خیال میرے ذہن میں سرسرایا۔ آخر وہ کون لوگ ہیں جو گاؤں والوں کو اس عور سے نجات دلانا چاہتے ہیں؟ اور پھر اس کی موت کے لئے پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں تھوڑی دیر بعد یہ خدشات سوال بن کر میری زبان پر آ گئے۔

ادریس الحق نے میرے خدشات کو بڑی سنجیدگی سے سنا اور کسی قدر توقف کے کہا۔ "اس ملک میں چند ایسے خدا ترس بندے بھی موجود ہیں جو ظلم و ستم کی کہانیاں کر گاؤں والوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ اس عورت سے عاجز آ گئے ہیں انہیں اس عورت سے جب ہی نجات مل سکتی ہے جب اس کے وجود سے دنیا کو پاک دیا جائے۔"

ادریس الحق کی بات میرے دل میں بیٹھ نہیں سکی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ

ہمارے معاملے کا پس منظر کچھ اور ہی ہے۔ وہ اصل بات گول کر گیا ہے۔ اس نے تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھایا ہے۔ بہرحال اب مجھے گاؤں تو جانا ہی تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہی سارے حقائق میرے علم میں آ سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ میں آنکھ بند کر کے ادریس الحق کی بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ یہ شخص مجھے معتبر نہیں لگتا تھا۔

میں نے قدرے توقف کے بعد ادریس الحق سے پوچھا۔ "اس عورت کا نام کیا ہے؟"

"عالیہ۔"

"عالیہ؟" میں نے زیر لب دہراتے ہوئے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔ میری یادداشت میں آج بھی اپنے گاؤں کی بہت سی عورتوں کے نام موجود تھے لیکن کوشش کے باوجود میرے ذہن میں عالیہ نامی کسی عورت کا تصور نہ ابھر سکا۔ اس نام کی کوئی عورت وہاں نہیں تھی۔

"کیا اس عورت کا تعلق اس گاؤں سے ہے یا وہ کہیں اور سے آئی ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اس گاؤں کی عورت نہیں ہے۔" ادریس الحق نے جواب دیا۔

"آپ کے پاس اس عورت کی کوئی تصویر تو ہو گی؟" میں نے دریافت کیا۔

"اتفاق سے اس کی کوئی تصویر میرے پاس نہیں ہے اور نہ ہی میں نے اس کی کوئی ضرورت سمجھی۔" ادریس الحق نے کہا۔ "گاؤں پہنچو گے تو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ اس نے حویلی خرید کر اس میں رہائش اختیار کر لی ہے۔"

☆------☆------☆

میں نے اعشاریہ پینتالیس بور کا ایک امریکن ریوالور خریدا جو حال ہی میں بازار میں آیا تھا۔ یہ ریوالور خاصا قیمتی تھا مگر اتنا ہی خطرناک بھی۔ یہ جدید ترین تھا۔ اسی سال متعارف کرایا گیا تھا۔ میں نے احتیاطاً سو گولیاں بھی ساتھ خرید لیں اور دونوں چیزیں کاغذ

کے لفافے میں رکھ کر ایک ایسا بنڈل بنا لیا کہ دیکھنے والے کو گمان نہیں گزر سکتا تھا کہ اس پیکٹ میں کیا چیز موجود ہے۔ میں نے چند جوڑے کپڑوں کے رکھ کر نیچے ریوالور والا پیکٹ چھپا دیا۔ مزید کچھ تیاریوں کے بعد میں دوسرے دن رات کے وقت سٹیمر کے ذریعے باریسال روانہ ہو گیا۔ مجھے باریسال پہنچ کر حسن پور کے لئے لانچ لینا تھی۔ کوئی سٹیمر یا لانچ براہ راست یہاں سے حسن پور نہیں جاتی تھی۔ حسن پور باریسال سے سو میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع تھا۔

☆------☆------☆

سٹیمر میں سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو میری نیند جیسے اڑ گئی تھی۔ میرا دل پیش آنے والے واقعات کا سوچ سوچ کر دھڑکتا رہا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات کی ایک یورش سی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں ایک عورت کو کس طرح سے قتل کر سکوں گا۔ میں نے کبھی قتل و غارت گری میں حصہ نہیں لیا تھا۔ میدان جنگ کی بات اور تھی۔ ایک عورت کو قتل کرنا کوئی بہادری کا کام نہیں تھا۔ ایک احساسِ جرم میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال رہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حالات مجھے اس بری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیں گے کہ میں ایک عورت کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا۔ میرے مقابلے پر کوئی مرد ہوتا تو شاید میں اس انداز سے نہ سوچتا۔ مگر وہ ایک عورت تھی۔ کیا ایک عورت واقعی اس قدر ظالم بھی ہو سکتی ہے کہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹانا اشد ضروری ہو جائے؟

صبح باریسال پہنچا تو معلوم ہوا کہ حسن پور کے لئے لانچ شام کے وقت جاتی ہے۔ میں نے سہ پہر تک کا وقت باریسال میں گھوم پھر کر گزارا اور لانچ کی روانگی سے ایک گھنٹہ قبل گھاٹ پر پہنچ گیا۔ گھاٹ پر بہت سے لوگوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں میری نظر چار آدمیوں پر پڑی جن کی حرکات و سکنات کسی قدر پُراسرار اور مشتبہ سی تھیں۔ وہ چاروں ایک گوشے میں کھڑے ہوئے تھے اور ان کی معنی خیز نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میں لانچ

کے انتظار میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا تو ان کی نظروں کو اپنے تعاقب میں پاتا تھا۔ جیسے وہ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دینا چاہتے ہوں۔ وہ مجھ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں اپنا شک دور کرنے کے لئے انہیں چکمہ دے کر ایک قریبی ہوٹل میں جا چھپا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے انہیں بدحواسی کے عالم میں سڑک پر اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے پایا تھا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ شاید میں ان کا شکار تھا۔

مجھے اندیشوں نے گھیرنا شروع کیا۔ یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ کہیں یہ ادریس الحق کے ساتھی تو نہیں جو مجھ سے ایک لاکھ روپے چھین لینے کے لئے میرے تعاقب میں لگ گئے ہیں مگر روپے چھیننے کے لئے انہیں اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اسی دن اور رات میرے گھر پر دھاوا بول سکتے تھے جب میں رقم لے کر گھر پہنچا تھا۔ یہ لوگ اس قدر احمق بھی نظر نہیں آتے تھے کہ رقم کی غرض سے باریسال آ جائیں۔ پھر اس امر سے سب واقف ہیں کہ کوئی بھی شخص اتنی بڑی رقم اپنی جیب میں لئے نہیں پھرتا۔ میں نے وہ رقم بینک میں ایک فرضی نام سے اکاؤنٹ کھلوا کر محفوظ کر دی تھی۔ میری جیب میں اس وقت ایک ہزار روپے تھے۔ مگر جس ملک میں مفلسی اور غربت چاروں طرف پھیلی ہوئی ہو وہاں ایک ہزار کے لئے بھی قتل ہو سکتا تھا۔

میرا ذہن انجانے دشمن کی طرف چلا گیا۔ ادریس الحق کی باتوں سے میں نے قیاس لگایا تھا کہ میرے انجانے دشمن نے میرے راز اس کے ہاتھ فروخت کر دیئے ہیں۔ ادریس الحق اور اس کے درمیان کوئی ساز باز ضرور تھی یا پھر وہ دونوں ہی میرے خلاف سرگرم عمل تھے۔ میرے دشمنوں کے دل سے شاید ابھی بھڑاس نہیں نکلی تھی اس لئے وہ مجھے مزید زک پہنچانے پر تلے بیٹھے تھے اور انہوں نے چار بدمعاشوں کو میرے تعاقب میں لگا دیا تھا۔ اب حسن پور تک میرے ساتھ کس قسم کے واقعات پیش آئیں گے' اس کے بارے میں مجھے قطعی کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن اس بات کا خوف و خدشہ تھا کہ وہ کچھ

نہ کچھ میرے ساتھ ضرور کریں گے۔ اس کے لئے مجھے چوکنا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی۔

سلطانہ نامی لانچ حسن پور جاتی تھی۔ وہ اپنے وقت پر آ گئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسافروں سے کھچا کھچ بھر گئی۔ میرا ارادہ اول درجے سے سفر کرنے کا تھا مگر ان بدمعاشوں کی وجہ سے میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور تیسرے درجے میں گھس گھسا کر بیٹھ گیا۔ اس طرح میں وقتی طور پر خطرات سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اتنے مسافروں کے درمیان وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔

اس درجے میں کسی قدر حبس اور گھٹن کی کیفیت تھی مگر لانچ چلتے ہی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں لانچ کا زیریں حصہ فرحت بخش بن گیا۔ وہ چاروں کسی منصوبے کے تحت میرے تعاقب میں تھے۔ وہ چاروں باری باری زیریں گوشے میں آ کر ایک چکر لگاتے اور میری طرف تمسخرانہ مسکراہٹ اچھالتے ہوئے دوبارہ اوپر چلے جاتے۔ مجھے ان کے بار بار چکر لگانے کی وجہ سے ہنسی بھی آ رہی تھی۔ انہیں جیسے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں میں کھڑکی سے پانی میں چھلانگ لگا کر ان کے ہاتھ سے نہ نکل جاؤں۔

لانچ ساری رات چلتی رہی۔ صرف دو تین گاؤں پر کچھ دیر کے لئے رکی تھی۔ میں ایک پل کے لئے بھی نہیں سو سکا تھا۔ ساری رات میرے ذہن میں خوف و ہراس کے بادل چھائے رہے اور اندیشے زہریلے سانپوں کی طرح لہراتے اور ڈستے رہے تھے۔ میں اپنے دشمنوں سے غافل رہ کر انہیں کوئی موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ لوگ میری جان کے دشمن نہیں ہیں۔ کیونکہ مجھے قتل کرنا ان کے لئے قطعی دشوار نہ تھا۔ البتہ وہ مجھے کسی سنگین واقعے میں ملوث کر سکتے تھے تاکہ میں اس میں ایسا پھنس جاؤں کہ نکل ہی نہ سکوں۔ انہوں نے رات کے وقت بھی میری نگرانی کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے آ کر نیچے جھانک جاتے تھے۔

وقت گزاری کے لئے میں نے اپنے گاؤں اور عالیہ کے بارے میں سوچنا شروع کر
یہ عورت میرے لئے ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ بہرحال اب گاؤں پہنچ کر ہی اس سلسلے میں کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا۔ میرے لئے یہ بات بھی خاصی تعجب خیز تھی کہ اس نے رہائش کے لئے ایسی حویلی کا انتخاب کیوں کیا جو گاؤں میں آسیب زدہ مشہور تھی اور مدتوں سے ویران پڑی ہوئی تھی۔ میں اپنے بچپن کے دنوں میں اس حویلی کے بارے میں طرح طرح کے قصے اور کہانیاں سنا کرتا تھا۔ انہی میں سے ایک حکایت یہ بھی تھی کہ اس حویلی کو ہندوستان کی ایک ریاست کے مہاراجہ نے تعمیر کیا تھا۔ پھر تحریک آزادی اور انگریزوں کے استحصال سے خوفزدہ ہو کر اس حویلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کی تین بیویاں اور دس لڑکے تھے۔ لڑکوں کی شادی کے بعد مہاراجہ دنیا سے ہمیشہ کے لئے سدھار گئے۔ اپنے پیچھے انہوں نے بہت بڑا خزانہ چھوڑا تھا۔ اس خزانے کی تقسیم نے مہاراجہ کے بیٹوں اور بیویوں میں باہمی چپقلش پیدا کر دی اور ایک دن ایسا خون خرابہ ہوا کہ پوری حویلی اجڑ کے رہ گئی اور پھر کبھی آباد نہ ہو سکی۔ روایت کے مطابق مہاراجہ کا سب سے چھوٹا بیٹا اس خون خرابے سے محفوظ رہا تھا۔ کیونکہ وہ ان دنوں لندن میں زیر تعلیم تھا۔ کئی برس کے بعد وہ کلکتہ واپس آ کر وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گیا' تاہم اس نے کبھی گاؤں آ کر اپنے باپ کی نشانی کو دیکھنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔ یہ حویلی آہستہ آہستہ آسیب زدہ مشہور ہو گئی۔ ویسے بھی حویلی گاؤں کے انتہائی سرے پر آبادی سے اس قدر دور تھی کہ کوئی اس طرف پھٹکتا بھی نہیں تھا۔

صبح ہوئی تو میرا خوف و ہراس کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ دن کی روشنی میں وہ بدمعاش مجھ پر حملہ نہیں بول سکتے تھے۔ وہ دن بھی بغیر کسی مصیبت کے گزر گیا۔ جب لانچ چاند نگر پہنچی تو سرمئی شام پھیلی ہوئی تھی۔ اب حسن پور محض تین میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ چاند نگر میں لانچ تقریباً خالی ہو گئی تھی۔ میں زیریں حصے میں اکیلا تھا اور اپنی نشست پر بیٹھا ہوا دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے گاؤں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اٹھارہ

برس کا عرصہ کس قدر طویل ہوتا ہے۔ مجھ پر جذبات کی کیفیات ایسی طاری ہوئیں
اپنے اردگرد کا ہوش بھی نہیں رہا۔ میں اس وقت چونکا جب چاروں بدمعاش خاموشی۔
نیچے آکر میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میری غفلت کے باعث انہیں مجھے گھیر۔
موقع مل گیا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں رہا تھا کہ دستی بیگ سے ریوالور
سکوں۔

وہ چاروں میری طرف بڑھنے لگے۔ ان کے چہروں پر درندگی اور سفاکی چھائی
تھی۔ لانچ سبک رفتاری سے حسن پور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انجن کا شور اس قدر گو
رہا تھا کہ مدد کے لئے چیخنا بھی لاحاصل تھا۔ تاہم میں نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظا
نہیں کیا۔ میں نے خود پر قابو پایا ہوا تھا۔ میں ان چاروں سے مقابلے کے لئے اپنے آپ
پوری طرح تیار کر چکا تھا۔

چند ثانیوں کے بعد وہ چاروں بدمعاش مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے ایک بدمعاش
تو فوراً ہی ڈھیر کر دیا تھا۔ میرا مکا اس کے پیٹ میں لگا تھا۔ وہ تڑپ کر اور چیخ مار کے
پراوندھا گر پڑا۔ فرش نے اس کی کھوپڑی بجادی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر ا
اشتعال میں آگئے۔ ان میں سے ایک بدمعاش نے میرے پیچھے آکر مجھے اس بری طر
جکڑ لیا کہ میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ بقیہ دو بدمعاشوں نے مجھ پر لاتوں اور گھونسوں
بارش شروع کر دی۔ ان کی ضربوں سے میرے جسم کا کوئی حصہ محفوظ نہیں رہ سکا۔
اس بدمعاش کے شکنجے میں اس بری طرح جکڑا ہوا تھا کہ نکلنے کا موقع بھی نہیں مل سکا
بس میرے منہ سے دلخراش چیخیں اور کراہیں نکلتی رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ مجھ پر غنود
طاری ہونے لگی۔ میری آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں اور میری آنکھوں کے سامنے
اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اچانک ہی ایک بدمعاش نے کسی سخت چیز سے میرے سر پر بھر
وار کیا۔ ساری دنیا مجھے چکر کھاتی ہوئی نظر آنے لگی اور میں تاریکیوں میں ڈوبنے لگا
دوسرے لمحے میں ہوش وحوس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے سر کے زخم میں درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی ہوئی
محسوس کیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک لطیف سی مہک میرے حواس پر چھانے لگی۔ اس
مہک نے کسی حد تک میری تکلیف کے احساس کو کم کر دیا تھا۔ میں نے چند لمحوں کے
بعد اپنی منوں بھاری پلکیں اٹھا کر آنکھیں کھول دیں۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند کی
چادر پھیلی ہوئی تھی۔ چند ثانیوں میں دھند چھٹ گئی۔ میں نے اپنے اوپر سولہ سترہ سال
کی لڑکی کو جھکا ہوا پایا۔ وہ بے حد حسین تھی۔ قدرت بعض پیکر ایسی توجہ سے تراشتی ہے
کہ اس میں کوئی عیب اور کمی نہ رہ جائے۔ اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے لانبے سیاہ
بال بتا رہے تھے کہ وہ ابھی ابھی نہا کر آئی ہے۔ ایک دلفریب خوشبو اس کے گیسوؤں سے
پھوٹ رہی تھی۔ اس کی پیشانی شہابی اور فراخ تھی۔ بھنورے جیسی سیاہ آنکھوں میں
جھیل سی گہرائی تھی۔ اس کی نگاہیں میرے ہاتھ کی بندھی ہوئی پٹی پر مرکوز تھیں۔ میں
نے اس کے حسین چہرے پر فکرمندی کے آثار دیکھے۔ معاً اس کی نگاہیں میرے چہرے
کی طرف اٹھیں۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چراغ جلنے لگے اور
رخساروں پر سرخی پھیل گئی۔

اس نے دمکتے چہرے اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بشاش
لہجے میں پوچھا۔ "آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہوں اور زندہ ہوں۔" میں نے جواب دیا اور مجھے اپنی آواز بہت دور سے
آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

میں نے اپنا ہاتھ بے اختیار زخم کی طرف بڑھانا چاہا۔ کیونکہ اس میں درد کی لہر اٹھی
تھی۔ لڑکی نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے پھول جیسے نرم و نازک ہاتھ کے لمس
سے میرے بدن میں جیسے اپنائیت کے بے پایاں جذبے کی فرحت سرایت کر گئی۔ اگر
میری کوئی بیٹی ہوتی تو شاید میں اس کے ہاتھوں میں بھی لمس کا ایسا ہی راحت انگیز سرور

محسوس کرتا۔ کیا لطیف سا لمس تھا۔ میں اپنی زندگی میں پہلی بار ایک انوکھے اور انمول
جذبے سے آشنا ہوا تھا۔ میں اپنا درد اور زخم کی ٹیسیں بھول گیا تھا۔ اپنے آپ کو بھی
بھول گیا تھا۔ میری رگ رگ میں اس لڑکی کے لئے انجانی محبت کا جذبہ ایک طوفان بن
کر بپھرنے لگا تھا۔

"نہیں .... نہیں' آپ ہاتھ نہیں لگائیں۔" اس کی جھیل سی آنکھوں میں
خوف سمٹ آیا۔ اس نے جل ترنگ جیسی آواز میں کہا۔ "جناب! زخم ابھی بھرا نہیں
ہے۔ کچا ہے۔ آپ کو اپنا بڑا خیال رکھنا ہو گا۔"

میں نے اپنے اندر بڑی نقاہت محسوس کی۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے نازک
ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جیسے کوئی فرحت کا خزانہ تھا۔ جو میرے زخموں
میں بجلی کی لہروں کی طرح سرایت کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا اگر وہ میرے
ہاتھ کو اس طرح اپنے ہاتھوں میں لئے چند گھنٹے بیٹھی رہی تو زخم جلدی مندمل ہو جائیں
گے۔ اس نے چند لمحوں کے بعد میرا ہاتھ آہستگی سے میرے سینے پر رکھ دیا۔

میں نے پل بھر کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرے زخم میں دوبارہ ٹیسیں
اٹھنے لگی تھیں۔ میں نے پھر اپنی آنکھیں کھول کر پتھرائی ہوئی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ
لیا۔ یہ ایک مستطیل کمرہ تھا۔ دروازے کے پاس ایک بڑی سی چوکی پر سرخ رنگ کی دری
اور چاندنی بچھی ہوئی نظر آئی تھی۔ کمرے کے بیرونی دروازے کے عین سامنے لمبی
چوڑی مسہری دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی جس کے نرم و گداز اور بے حد آرام دہ بستر
میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ لڑکی مسہری پر میرے پاس دو زانو ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔

کمرے میں کسی قدر حبس اور گھٹن سی تھی جبکہ کمرہ بے حد کشادہ تھا۔ میرے
چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھرنے لگیں۔ باہر بھی شاید شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ اس نے
میری بے چینی محسوس کر لی اور پھر اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ میرا چہرہ پسینے میں تر ہو رہا
ہے۔ اس نے اپنی ساڑھی کے پلو سے میرے چہرے کا پسینہ صاف کیا اور مسہری سے اتر

کر مغربی سمت کی کھڑکی کھول دی۔ ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا اندر آیا۔ میں نے کھڑکی کی
راہ سے صاف شفاف آسمان کو دیکھا۔ باہر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں یہ اندازہ
نہیں کر سکا کہ دن کس قدر چڑھ آیا ہے۔ میں نے بولنا چاہا مگر پیاس سے میرا حلق خشک
ہو رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس سے پانی مانگا۔ وہ تیر کی طرح کمرے سے
نکلی اور فوراً واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا بڑا سا پیالہ تھا۔ میں نے پانی پینے کے
لئے اٹھنا چاہا تو سارے بدن میں درد کی لہر پھیل گئی۔ میں بے حس و حرکت پڑا رہ گیا۔
میرے بدن کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ لڑکی نے مسہری پر چڑھ کر پیالہ میرے سرہانے کے
قریب رکھا اور دو زانو ہو کر میرا سر اپنے زانو پر رکھ کر اور پیالہ اٹھا کر میرے خشک ہونٹوں
سے لگا دیا۔

ٹھنڈے پانی کے گھونٹ میرے حلق کو تر کرتے ہوئے جسم میں اترنے لگے۔ میں
جیسے کوئی امرت پی رہا تھا۔ میرے جسم میں طاقت عود کر آئی۔ میں نے سیر ہو کر پانی پیا۔
راحت کا احساس میرے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ پانی پلانے کے بعد اس نے
میرا سر آہستگی سے نیچے رکھ دیا۔ میں نے اس پل اپنی آنکھیں بند کر کے سوچا۔ اگر میری
بیٹی ہوتی تو شاید وہ بھی اسی طرح میری خدمت کرتی۔ مجھے اپنی اس زندگی پر پچھتاوا
ہونے لگا کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی۔ میں نے اپنا گھر اوروں کی طرح کیوں نہیں
بسایا۔ لوگ اس لئے تو شادی کرتے ہیں کہ شادی جذبوں اور محبتوں کو پانے کا راستہ ہے۔
ان کے ہاں بچے پیدا ہوتے ہیں اور کتنے چراغ جل اٹھتے ہیں۔ ان چراغوں کو بجھانے کے
لئے کتنے طوفان آتے ہوں گے' کیسی کیسی آندھیاں زمانے کی حرارت بن کر اٹھتی ہوں
گی لیکن ماں باپ ان طوفانوں کے آگے سینہ سپر ہو جاتے ہیں تاکہ یہ چراغ بجھنے نہ پائیں
جن سے ان گھروں میں زندگی ہے' رونق ہے' بہاریں ہیں' حسن ہے۔ شاید اسی جذبے کا
نام محبت' ممتا اور شفقت ہے۔

میں نے آنکھیں کھول کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے او

مسکراتے ہوئے پایا۔ میں بھی جواباً مسکرا دیا اور اس سے پوچھا۔ "میں کہاں ہوں؟"

اس کے رخسار دہکنے لگے۔ وہ آہستہ سے بولی۔ "میرے گھر میں۔"

میں اس لڑکی کے گھر میں کس طرح اور کیوں کر پہنچا مجھے اس کی کچھ خبر نہ تھی فلمی کہانی کی طرح میں ایک اجنبی اور پیاری سی لڑکی کے گھر میں تھا میں نے اس سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ "کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ مجھے ان خطرناک بدمعاشوں سے نے بچایا؟ یہاں مجھے کون لے کر آیا؟ وہ بدمعاش لوگ کہاں ہیں؟"

"میں اپنی لانچ میں ادھر سے گزر رہی تھی کہ اچانک میری نظر مسافر لانچ زیریں حصے پر پڑی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگی۔ "میں نے دیکھا چار بدمعاش مل کر کو بری طرح مار رہے ہیں۔ آپ کو پٹتے ہوئے دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اپنی کا رخ اس لانچ کی طرف موڑ لیا۔ جس وقت میری لانچ قریب پہنچی اس وقت آپ ہوش ہو چکے تھے اور ان بدمعاشوں نے آپ کو ندی میں پھینکنے کے لئے اٹھا رکھا تھا۔ اور میرے ساتھ جو مرد تھے جنہیں میں نے لفٹ دی تھی شور مچا دیا۔ ان بدمعاشوں جب ہمیں دیکھا تو انہوں نے آپ کو فرش پر پھینک دیا اور ندی میں کود گئے۔ پھر و جانے کس سمت تیزی سے اندر کی طرف تیرتے ہوئے نکل گئے۔ مجھے ان کی نہیں کی فکر تھی۔ میں یوں بھی کسی شریف آدمی کے ساتھ ظلم ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتی پھر آپ کو شدید زخمی حالت میں اپنے گھر لے آئی۔ آپ کوئی دو دن تک مسلسل بے ہوش رہے ہیں۔"

میں نے اس نیک اور عظیم لڑکی کو ممنون نگاہوں سے دیکھا میری آواز جذبے سرشاری سے تھرتھرائی۔ "میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھول سکوں گا۔"

"آپ مکمل صحت یابی تک میرے ہاں زیر علاج رہیں گے۔" وہ زیر مسکرائی۔ "آپ اب اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔"

"اگر میں ساری زندگی یہاں رہنا چاہوں تو کیا رہ سکتا ہوں۔" میں نے اس

آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ساری زندگی؟ وہ کس لئے؟" اس کے حسین چہرے پر معصومیت بکھر گئی۔

"اس لئے کہ اس ریاکاری اور منافقت کی دنیا میں کسی شخص کو بیٹی جیسا تیماردار ملے وہ یہاں سے جانا کیسے پسند کرے گا؟"

"اوہ۔" وہ دلکش انداز میں مسکرا دی۔ "کیا آپ کی کوئی بیٹی نہیں ہے؟"

"نہیں۔" میں نے اداسی سے جواب دیا۔ "میں شادی شدہ ہوتا تو شاید تم جیسی ن چار بیٹیاں ضرور ہوتیں۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کی بیٹیاں ہوتیں۔" اس نے شگفتگی سے کہا۔ "شاید کے بیٹے ہی بیٹے ہوتے۔ کیوں؟"

"بنگال میں کون سا ایسا گھر ہے جہاں بیٹیاں نہیں ہیں۔ اس لئے میں بھی کئی ایک کا باپ ہوتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" اس نے تائیدی لہجے میں کہا۔ "اچھا تو آپ مجھے اپنی بیٹی سمجھیں۔ ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا نام ہے ہماری بیٹی کا؟"

"پروین۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی شوخی آئی۔ "لیکن مجھے سبھی پارو کہہ کر تے ہیں۔ آپ بھی پارو کہہ کر بلا سکتے ہیں۔"

"نام بھی تمہاری طرح پیارا ہے۔" میں بولا۔ "میں تمہیں پارو کے نام سے ہی وں گا لیکن مجھے اس گھر میں تمہارے سوا کوئی اور نظر نہیں آیا۔ تمہاری امی ابو کہاں ہیں؟ تم کتنے بھائی بہن ہو؟"

"میرے ابو؟" اس کا لہجہ یکسر بدل گیا۔ اس کا چہرہ بھی بجھ گیا۔ اس کی بڑی بڑی نکھوں سے اداسی جھانکنے لگی۔ وہ اپنا خوشنما سر ہلاتے ہوئے افسردگی سے بولی۔ "آپ سمجھ لیں کہ میرے ابو نہیں ہیں۔ کوئی بھائی بہن بھی نہیں ہے۔ میری صرف ایک

امی ہیں' وہی میری سب کچھ ہیں۔"

پارو کو اپنے باپ سے شاید کسی قدر جذباتی لگاؤ رہا ہو گا۔ اس لئے اس کے باپ کی جدائی کا غم ابھی تازہ تھا۔ شاید اس کے باپ کے ساتھ حال ہی میں کوئی ایسا حادثہ پیش آیا تھا جس نے ان کے درمیان دائمی جدائی پیدا کر دی تھی وہ اپنے باپ مرحوم اس لئے بھی نہیں کہتی ہو گی کہ ایسا کہتے ہوئے بہت تکلیف اور اذیت محسوس کرتی ہو گی۔ عموماً بیٹیوں کو اپنے باپ سے بہت پیار اور جذباتی لگاؤ ہوتا ہے۔

میں نے اس کے باپ کے بارے میں مزید کچھ پوچھنا بہتر نہیں سمجھا۔ اس افسردگی نے میرے دل پر خاصا اثر کیا تھا۔ میں نے موضوع بدلا اور پوچھا۔ "تمہار کہاں ہیں؟"

پارو کو جواب دینے میں کچھ تامل سا ہوا تھا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے دیا۔ "وہ باریسال اپنی ایک سہیلی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لئے گئی ہوئی ہیں شاید کچھ دنوں بعد لوٹ کر آئیں گی۔"

"تم کس لئے شادی میں نہیں گئیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "جبکہ لڑکیو شادی بیاہ کی تقریبات سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔"

"اس لئے کہ میرا موڈ نہیں تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اور ہاں۔" اچانک سراسیمہ ہوتے ہوئے بولی۔ "میں تو بھول ہی گئی تھی حکیم جی نے آپ سے اور کسی سے بھی زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا تھا آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے کیو آپ دو دن کے بعد ہوش میں آئے ہیں نا' آپ بھوک سے نڈھال ہو رہے ہوں میں نے تو آپ سے کھانے کے لئے بھی نہیں پوچھا۔ باتیں بگھارنے بیٹھ گئی۔ آئی ویری ویری ساری .... میں ابھی آپ کے لئے دودھ اور توس لے کر آتی ہوا آپ کو دو چار روز تک سخت پرہیز کرنا ہو گا۔"

وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکل گئی لیکن میرے اندر تجسس کی

بیدار کر گئی۔ اپنے نفیس لب ولہجے' عادت واطوار کی شائستگی اور لباس کے سلیقے سے وہ کسی طرح بھی گاؤں کی رہنے والی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس میں ایک شہری اور تعلیم یافتہ لڑکی ہونے کی بھرپور جھلک تھی۔ اس کی اپنائیت میں ایک بے ساختہ پن تھا' اس میں کسی قسم کی کوئی جھجک نہ تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں ایسی کہاں ہوتی ہیں۔

کوئی ہفتہ بھر پارو کی نگرانی میں میرا علاج ہوتا رہا۔ اس نے بتایا کہ ہائی اسکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے نرسنگ کی تربیت حاصل کر لی تھی اور اس کے پاس ڈپلومہ بھی تھا اور اب وہ ڈھاکہ ایڈن کالج سے انگریزی ادب میں ایم اے کر رہی ہے۔ وہ چھٹیوں میں اکثر ماں کے پاس چلی آتی ہے۔ اسے شہر کے مقابلے میں گاؤں بہت اچھا لگتا ہے اور یہاں بڑا سکون سا ملتا ہے۔

میں اس کے لئے ایک اجنبی مسافر کی طرح رہا۔ میں نے دانستہ اس سے عالیہ کے بارے میں نہیں پوچھا اور نہ ہی اس نے کبھی اس ظالم اور شیطان صفت عورت کا کوئی تذکرہ کیا۔ اسے میں نے اپنے متعلق بھی کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت محسوس کی تھی۔ صرف میں نے اسے اتنا بتایا تھا کہ میں ایک ریٹائرڈ فوجی افسر ہوں اور اپنے ایک دوست سے ملنے حسن پور آیا ہوں۔ میرے دل میں کئی بار یہ خیال آیا کہ اس سے کیوں نہ عالیہ کے بارے میں دریافت کروں۔ پھر کچھ سوچ کر یہ خیال ترک کر دیتا تھا۔ اس کی باتیں اس قدر سندر ہوتی تھیں کہ میں اس میں کھو کر رہ جاتا تھا۔

پارو کی شخصیت میرے لئے پُراسرار اور ناقابل فہم سی ہو گئی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اب تک مجھے اس گھر میں پارو کے سوا کوئی اور فرد نظر نہیں آیا تھا۔ حتیٰ کہ میں ان حکیم جی کی شکل بھی نہیں دیکھ سکا تھا جو میرا علاج کر رہے تھے اور جن کے مطب سے میرے لئے دوائیاں آتی تھیں ہاں' ایک بوڑھی ملازمہ ضرور تھی جو رات کے وقت بھی کسی ضرورت کے پیشِ نظر میرے کمرے میں سوتی تھی لیکن وہ بہری اور گونگی تھی۔ یہ گھر ایک اونچے ٹیلے پر بنا ہوا تھا جو چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہوا تھا۔ اس کا

رقبہ کم از کم ایک مربع فرلانگ ہو گا۔ بہرکیف یہ گھر بے حد پُرسکون اور گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ ایک مریض کی صحت یابی اور اس کے آرام کے لئے بہترین جگہ تھی۔

☆------☆------☆

میں نے پارو کو ایک بوٹ میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ اس ٹیلے سے دو تین میل کے فاصلے پر اطراف میں گاؤں' درخت اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ میں یہاں سے نکلنا بھی چاہتا تو مجھے کسی بوٹ یا کشتی کی ضرورت پڑتی پارو اکثر کہیں آتی جاتی رہتی تھی اس کی ماں ایک بار بھی مجھ سے ملنے نہیں آ سکی کیونکہ وہ اب تک گاؤں سے نہیں لوٹی تھی۔ میں نے اس سے بہت سی باتیں پوچھی تھیں لیکن اس نے بڑی خوبصورت سے ان کا جواب گول کر دیا تھا مجھے بھی ان باتوں سے کوئی خاص سروکار نہ تھا۔

میری توانائی بھی رفتہ رفتہ بحال ہو رہی تھی۔ میں کسی قدر تیزی سے روبہ صحت ہونے لگا۔ میرے زخم بھی مندمل ہو گئے تھے۔ پارو نے مجھے بتایا تھا کہ حسن پور یہاں سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر ہے۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب مجھے اس جگہ سے رخصت ہو جانا چاہئے۔ یہی کیا کم تھا کہ ایک اجنبی لڑکی نے خلوص و محبت کے انمٹ جذبے سے میرا ایک باپ کی طرح خیال رکھا تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ پارو مجھے باپ کی طرح چاہنے لگی ہے وہ مجھ سے خاصی دیر تک باتیں کرتی رہتی تھی میں بھی اس کی رفاقت کا بے چینی سے منتظر رہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی میں یہ سوچ کر اداس ہو جاتا کہ کیا میں اس لڑکی سے دور رہ سکوں گا جس نے مجھے ایک انوکھے جذبے سے روشناس کرایا ہے۔ میں نے دل پر جبر کی سل رکھ کر اس سے اجازت چاہی تھی۔ اس نے مجھ سے مزید ایک دن ٹھہر جانے کی درخواست کی کیونکہ وہ بھی دوسرے دن ڈھاکہ شہر جا کر اپنی تعلیمی سرگرمیاں شروع کرنے والی تھی۔

اس روز وہ نصف رات تک مجھ سے باتیں کرتی رہی تھی اور اس کا دل اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا اور نہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اسے جانے دوں۔ اب لگ رہا تھا کہ آج کی رات ہماری زندگی کی آخری رات ہے۔

☆------☆------☆
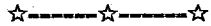
اگلے روز میری آنکھ کھلی تو شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ یہ حقیقت تھی کہ میں اپنے بستر کی بجائے کھلے آسمان کے نیچے مخملیں گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ قریب ہی ندی کا کنارہ تھا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا اور پھر اپنے گرد کا جائزہ لینے لگا۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر میرا سفری بیگ رکھا ہوا تھا۔ دور دور تک چھوٹی بڑی جھاڑیاں اور لمبی لمبی گھاس نظر آرہی تھی۔ پورا علاقہ سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ یہ گوشہ حسن پور کا تھا۔ دور بہت دور حسن پور کی آبادی دکھائی دے رہی تھی۔ مغربی سمت میں مہاراجہ بھرت چندر کی حویلی کا عقبی حصہ بھی بہت صاف اور واضح طور پر نظر آرہا تھا۔

میں حیران و ششدر تھا کہ مجھے کس لئے یہاں لاکر ڈال دیا گیا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ گورکھ دھندا نہیں ہے؟ میں نے جو کچھ دیکھا کیا وہ خواب تھا؟ کیا خواب اتنے حسین بھی ہوتے ہیں؟ مجھے تھوڑی دیر تک یہ احساس ہوتا رہا کہ میں خواب ہی دیکھتا رہا ہوں۔ میں نے اپنا شک دور کرنے کی غرض سے اپنی قمیض کی آستین الٹ کر دیکھی۔ زخم مندمل ہو گئے تھے لیکن زخموں کے نشان ابھی باقی تھے۔ سر پر چوٹ کی جگہ دبانے سے ہلکا ہلکا درد بھی محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے ان تمام واقعات کے بارے میں سوچا جو یکے بعد دیگرے بڑی تیزی سے میری زندگی میں رونما ہوئے تھے اور پھر یہاں آنے پر پروین کا بدمعاشوں کے ہاتھوں سے مجھے بچانا' میری تیمارداری کرنا' پھر مجھے کشتی یا بوٹ میں حسن پور پہنچانے کی بجائے بے ہوشی کے عالم میں یہاں چھوڑ کر چلے جانا۔ یہ سب کچھ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ آخر

اسے اس قدر پُراسرار بننے کی کیا ضرورت تھی؟ اس معصوم سی لڑکی کو کس بات کا خوف دامن گیر تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے دشمن نے پروین کو مجبور کیا ہو کہ وہ مجھے یہاں پھینک جائے یا پھر میرے دشمن نے یہ حرکت کی ہو؟ پروین کو شاید اس واقعے کی ہوا بھی نہ لگی ہو؟ لیکن میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا لیکن میرا یہاں کھڑے رہ کر ان باتوں پر غور کر کے وقت ضائع کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ جو نہیں ہونا تھا وہ ہو چکا تھا اور پھر اب شام ہو چکی تھی۔ دھندلکے اندھیرے کی آغوش میں جانے کے لئے بڑھ رہے تھے۔ حسن پور کی آبادی اس قدر دور تھی کہ وہاں پہنچتے پہنچتے رات بھی ہو سکتی تھی۔ میرے لئے وقت بہت قیمتی اور اہم تھا۔

میں نے اپنا سفری تھیلا کھول کر اس کا سرسری سا جائزہ لیا اس میں تمام چیزیں جوں کی توں موجود تھیں کسی بھی چیز کو چھیڑا نہیں گیا تھا۔ یکایک مجھے اپنے ریوالور کا خیال آیا اور یہ خوف بھی دامن گیر ہوا کہ کہیں اسے میرے دشمن کے آدمیوں نے غیر محسوس انداز سے نکال نہ لیا ہو؟ یہ خیال آتے ہی میرے خون میں تلاطم پیدا ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے کپڑوں کی تہیں کھولنا شروع کیں اور بیگ کی ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی جس طرح کسٹم والے الٹ پلٹ دیتے ہیں۔ ریوالور کا پیکٹ اپنی جگہ دیکھ کر مجھے اطمینان سا ہوا۔

میں نے تھیلا اپنے کندھے سے لٹکایا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاؤں کی سمت چل پڑا۔ تقریباً ایک میل کی مسافت میں نے ندی کے کنارے ساتھ ساتھ چل کر طے کی پھر اپنا رخ اس وسیع و عریض میدان کی طرف موڑ لیا جو جھاڑیوں کے پاس جاکر ختم ہوتا تھا۔ ان جھاڑیوں کی دوسری جانب ایک کچی سڑک تھی جو بل کھاتی ہوئی گاؤں کی طرف چلی گئی تھی۔ اس راستے پر دائیں جانب وہ پُراسرار سی حویلی تھی جس کا فاصلہ سڑک سے کوئی دو تین فرلانگ رہا ہوگا۔

سڑک پر پہنچ کر میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی تھی۔ فی الوقت حویلی کے پاس سے

میرا گزرنا کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں تھا۔ مجھے اپنے گاؤں پہنچ کر سب سے پہلے کسی ایسے دوست کو تلاش کرنا تھا جس کے ہاں میرے قیام کا بندوبست ہو سکے۔ مجھے امید تھی کہ میرا کوئی دوست مجھے اتنا لمبا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی بھولا نہیں ہو گا۔ میں نے بچپن کے حوالے سے اپنے دوستوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور تب میرے ذہن کے نہاں خانوں سے ایک شبیہ نکل کر میری نظروں کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ایک سنجیدہ اور معصوم سی صورت' میرا سب سے عزیز دوست' بے ساختہ میرے لبوں پر اس کا نام آ گیا' ابوبکر۔

وہ میرے بچپن کا دوست تھا میں ابوبکر کے ساتھ گزارے ہوئے خوشگوار لمحات کی یادوں میں ڈوب گیا۔ میری رفتار اس کے بارے میں سوچنے کی وجہ سے آپ ہی آپ دھیمی ہوتی چلی گئی تھی۔ گاؤں بھی اب ایک دو فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ میں زیر لب مسکراتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اچانک کسی کتے کی غراہٹ سن کر ایک دم سے اچھل پڑا۔ میری نس نس میں وحشت کی لہر دوڑ گئی۔ یہ غراہٹ کسی عام قسم کے کتے کی نہیں تھی۔ یہ آواز سامنے والی جھاڑیوں سے آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بس اب وہ جھاڑیوں سے نکل کر مجھ پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ میرے بدن پر لرزہ طاری ہونے لگا۔ تاہم میں نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا اور سفری تھیلا زمین پر رکھ کر کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس کے بند کھولنے لگا۔ میری متوحش نظریں بار بار سامنے والی جھاڑیوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اگر اس لمحے کتا جھاڑیوں سے نکل کر مجھ پر ٹوٹ پڑتا تو میں اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے خوف و ہراس کے عالم میں تھیلے کی ساری چیزیں الٹ پلٹ دیں تاکہ جلد سے جلد ریوالور کا پیکٹ نکال سکوں۔ بالآخر میں نے ریوالور والا پیکٹ باہر نکال لیا۔

ریوالور ہاتھ میں آتے ہی میرا خوف کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ میں نے چند لمحوں تک کتے کے باہر نکلنے کا انتظار کیا۔ جھاڑیوں کی سرسراہٹ برابر جاری تھی' کتے کی غراہٹ بھی آس پاس ہی گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ غراہٹ بند،

گئی۔ میں مزید چوکنا ہو گیا۔ کیونکہ اس گہری خاموشی نے خطرے کے احساس کو اور بڑھا دیا تھا۔ جب کئی لمحات گزر جانے پر بھی سناٹا طاری رہا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ پھر میں نے تیزی سے اِدھر اُدھر بکھرا ہوا سامان سمیٹا اور اسے جلدی جلدی تھیلے میں ٹھونسنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے تھیلا کندھے پر لٹکایا اور تیزی سے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ ریوالور بدستور میرے ہاتھ کی گرفت میں تھا اور میری انگلی لبلبی پر تھی' میں احتیاط کے طور پر بار بار پیچھے پلٹ کر بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ میری ساری توجہ اور نگاہ اطراف کی جھاڑیوں پر تھی۔ مگر پھر بھی کوئی آواز مجھے سنائی نہیں دی۔ غالباً کتا کسی اور سمت نکل گیا تھا۔

یکایک مجھے اس سفاک عورت کا خیال آیا جس نے گاؤں والوں کی زندگی کو جہنم بنا رکھا تھا۔ یہ کتا بھی اس نے پال رکھا ہو گا۔ میں کتوں کی تقریباً تمام نسلوں سے واقف تھا۔ میرے خیال میں وہ کوئی پالتو کتا تھا۔ اگر وہ شکاری کتا ہوتا تو یقیناً مجھے کسی صورت میں نہیں بخشتا شاید وہ کسی بلی یا کتے کو دیکھ کر غرایا ہو۔ یا یہ بھی امکان ہو کہ وہ شکاری کتا ہو اور اس کی زنجیر کسی شخص کے ہاتھ میں ہو۔ میں نے قیاس کیا کہ اس کتے کی مدد سے عالیہ نے گاؤں والوں میں خوف و ہراس اور دہشت پھیلا رکھی ہو گی۔ گاؤں کے لوگ شاید اسی کتے کی موجودگی سے خائف رہتے ہوں گے۔

جس وقت میں گاؤں میں داخل ہوا تو رات کی سیاہی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ گاؤں کا بازار سنسان اور ویران دکھائی دیا۔ ان اٹھارہ برسوں میں مجھے ایسی کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آئی جس سے اندازہ ہوتا کہ اس گاؤں نے کچھ ترقی کی ہے البتہ چند دکانوں اور مکانوں کا اضافہ ضرور محسوس ہوا تھا۔ عبدالکریم کا چھوٹا سا ہوٹل جو برگد کے پیڑ کے نیچے تھا وہ بھی بند دکھائی دے رہا تھا۔ حالانکہ وہ ہوٹل رات کے نو دس بجے تک ہر موسم میں کھلا رہتا تھا۔ اس کی چائے اور مٹھائی بہت اچھی ہوتی تھی اور ہم لوگ وہاں دیر تک ڈیرہ جمائے رہتے تھے۔ مجھے دروازے کے نیچے سے روشنی کھسرتی ہوئی دکھائی

دی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جاگ رہا تھا۔ راستے میں کوئی اکا دکا آدمی بھی نظر نہیں آیا۔
میں پہلے کبھی ایسی ویرانی نہیں دکھائی دی تھی۔ شاید شکاری کتے کے خوف کی وجہ
ہی اپنے اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ میں ابوبکر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ شہر
رہتے ہوئے آنکھیں روشنیوں کی عادی ہو چکی تھیں اس لئے گھپ اندھیرے میں
خاصا دشوار لگ رہا تھا لیکن جلد ہی میری نظریں اندھیرے میں ہر چیز کو دیکھنے اور پرکھنے
عادی ہو چکی تھیں۔

میں نے ابوبکر کا گھر آسانی سے شناخت کر لیا۔ وہ بڑے تالاب کے کنارے بنا ہو
تھا۔ سپاری ناریل اور کٹھل کے درختوں سے گھرا ہوا تھا اس مکان کا احاطہ وسیع و عریض
تھا اور اس میں کوئی نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں نے دروازے پر رک
اپنے کان اندر سے آنے والی آوازوں پر لگا دیئے۔ میں ہر طرح سے اپنی تسلی کر لینا
تھا۔ باتوں کے شور میں مجھے ابوبکر کی آواز سنائی دی وہ اپنے کسی بچے کو کسی بات پر
طرح ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا۔ برسوں اور صدیوں کے بعد جیسے اس کی آواز سنی تھی۔
کی آواز سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ میں نے یک گونا مسرت سے اپنا لرزاں ہاتھ بڑھا
آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ دستک کی آواز گونجتے ہی باتوں کا شور یک لخت
تبدیل ہو گیا۔ جیسے انہوں نے کسی شیر کی دھاڑ سن لی ہو۔ ان سب کو شاید حیرت ہوئی
گی کہ اس وقت کون ان کے دروازے پر آیا ہو گا؟ چند منٹوں کے بعد کسی کی آہٹ
ابھری اور بتدریج دروازے کے پاس آ کر تھم گئی۔

"کون ہے بھئی؟"

ابوبکر کی مانوس اور مٹھاس بھری آواز ابھری۔ جس میں کسی حد تک حیرت کا
بھی موجود تھا۔ چند منٹوں کی خاموشی کے بعد دروازہ کھل گیا۔

ابوبکر کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لالٹین تھی جس کی لو اس نے اونچی کر رکھی تھی۔
اس نے لالٹین کو اوپر اٹھایا تو اس کی روشنی میرے چہرے پر پڑنے لگی۔ اس نے میرے

چہرے کا بغور جائزہ لیا اور پھر اس کی آنکھوں میں استعجاب پھیل گیا وہ تنویم زدہ سے انداز
میں مجھے تکتا رہ گیا۔

کسی بھی شخص کی زندگی میں اٹھارہ برس کا عرصہ کم نہیں ہوتا ابوبکر اور میں ایک
جگ بیت جانے کے بعد ایک دوسرے کے سامنے مبہوت سے کھڑے تھے وقت کی نبض
جیسے رک گئی تھی۔ اگر میں نے اس کی آواز سنی نہ ہوتی تو غالباً اسے پہچان بھی نہ پاتا وہ
ان برسوں میں بہت بدل گیا تھا پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر لکیروں کا جال پھیلا
ہوا تھا بالوں میں چاندی جھلملانے لگی تھی اور اس کا جسم کمزوری کے باعث خمیدہ سا ہو گیا
تھا۔ ابوبکر مجھے پہچان چکا تھا کیونکہ میں ذرا بھی نہیں بدلا تھا صرف میرے بالوں میں کچھ
سفیدی آ گئی تھی۔ اسے مجھے اچانک اور غیر متوقع دیکھ کر اپنی بصارت پر جیسے یقین نہیں
آ رہا تھا۔ اس لئے وہ اپنی جگہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا تھا۔

"ابو!" میرے ہونٹوں پر سرگوشی کی طرح ایک لفظ مچلا اور سناٹے میں بازگشت کی
طرح گونجنے لگا۔

دوسرے لمحے ابوبکر نے لالٹین زمین پر رکھ دی پھر اس کے جوش سے لرزتے
ہوئے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے۔ اس نے اپنے بازو پھیلا دیئے وہ مجھے اپنے بازوؤں میں
سمیٹ لینا چاہتا تھا میں نے بھی اپنا تھیلا نیچے رکھ دیا اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے
بڑی محبت اور گرم جوشی سے بغلگیر ہو گئے۔ ابوبکر نے مجھے اس طرح بھینچ لیا جیسے وہ مجھے
اپنے وجود میں سما لینا چاہتا ہو۔ پھر وہ میرے کاندھے پر سر رکھ کر بچوں کے مانند سسکنے لگا
میں ایک طویل عرصے کے بعد اس کی محبت کا یہ انداز دیکھ کر جذباتی ہو گیا اور میری
آنکھیں بھیگ گئیں مجھے اس خلوص' چاہت اور پذیرائی کی توقع نہیں تھی میں سکتے کی
حالت میں اسے اور وہ مجھے دیکھنے لگا۔

اندر سے اس کی بیوی' نوجوان بیٹی اور کمسن سن بچے بھی نکل آئے۔ اس کی بیٹی کی
نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی اس نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"کیا ہوا ابا!" پھر اس نے جذباتی منظر جو دیکھا تو اپنی جگہ ٹھٹک گئی۔

رات کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد گھر میں باتیں کرتے رہے۔ پھر بہت دیر کے بعد ہم دونوں مکان کے باہر بنے ہوئے چبوترے پر آ بیٹھے اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ چاند کی ڈھلتی تاریخیں تھیں۔ آسمان پر نصف چاند منور تھا جس کی پھیلی کرنیں ہر سُو اپنا جال بن رہی تھیں۔ دھندلی چاندنی میں ناریل اور سپاری کے درختوں کا نظارہ بہت ہی دل فریب نظر آ رہا تھا۔

میں نے ابوبکر پر یہاں آنے کا مقصد کھل کر ظاہر نہیں کیا۔ البتہ اسے وہ واقعات سنا دیئے جو مجھ پر گزرے تھے ان واقعات میں ان بدمعاشوں کا تذکرہ بھی جنہوں نے لانچ میں میری درگت بنائی تھی پھر اس لڑکی کا بھی ذکر آیا جس نے تیمارداری کی تھی جو میری بیٹی بنی رہی اور پورے جذب اور لگن سے میری خدمت کی پھر میرے صحت یاب ہونے کے بعد مجھے ویرانے میں چھوڑ گئی۔

ابوبکر نے میری کہانی پوری توجہ سے سنی تھی۔ اسے بدمعاشوں والے واقعے پر قدرِ حیرت ہوئی۔ پروین کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ وہ آس پاس کے گاؤں اور کاروبار کے سلسلے میں بلاناغہ آتا جاتا رہتا ہے۔ اسے آج تک اس حلیے کی کوئی لڑکی دکھائی نہیں دی۔

میرے استفسار پر ابوبکر نے عالیہ کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ "چند برسوں پہلے کی بات ہے یہ حویلی اس عورت نے مہاراجہ کے بیٹے سے خرید لی تھی۔ اس حویلی کو اس نے ایک عالی شان محل کی طرح آراستہ و پیراستہ کیا۔ وہ سال میں دو تین مہینے کے لئے اس گاؤں میں آتی ہے اور کسی ملک کی رانی کی طرح بڑی شان و شوکت سے رہتی ہے اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ اسے خود نہیں معلوم کہ کتنا بینک بیلنس ہے۔ نوکر کی فوج اس کی خدمت اور حفاظت کے لئے مستعد رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بے شمار کتے بھی پال رکھے ہیں وہ رات کے وقت اپنے پالتو کتوں کو کھلا چھوڑ دیتی

لیکن آج تک ایسا حادثہ نہیں ہوا کہ کسی انسانی جان کو خطرہ لاحق ہوا ہو۔ پھر بھی لوگ ان کتوں سے خوفزدہ رہتے ہیں اور دن ڈوبتے ہی گھروں سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔"

ابوبکر نے میرے سوالوں کے جواب میں مزید بتایا۔ "اس عورت کی عمر تیس پینتیس سال کے لگ بھگ ہوگی لیکن اس کا حسن و جمال نوخیز لڑکیوں کو شرماتا ہے۔ وہ عورت کسی حد تک سخت مزاج بھی ہے لیکن فطرتاً بہت اچھی ہے۔ اس نے گاؤں والوں پر کبھی ظلم و ستم نہیں ڈھایا ہے البتہ ان چند لوگوں سے کسی نہ کسی طرح ان کی زمینیں خرید لیں جو اپنے وقت میں چوہدری بنے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں کوڑی کوڑی کا محتاج کر کے رکھ دیا جیسے اس نے ان سے کوئی انتقام لیا ہو۔ اس عورت کی شخصیت بڑی پُراسرار ہے اس کی زندگی پر پردہ پڑا ہوا ہے اس کے بارے میں بہت سی چہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی ہے کسی کا خیال ہے کہ وہ بیوہ ہے ایک بات اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اس کا شوہر لندن میں رہتا ہے جتنے منہ اتنی باتیں۔ اصل حقیقت کا کسی کو کچھ علم نہیں ہے۔"

"مگر ڈھاکہ میں اس عورت کے ظلم و ستم کی کہانیاں مشہور ہیں۔" میں آہستہ سے بولا۔ "سنا ہے کہ اس نے گاؤں والوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی ہے۔ وہ اپنی دولت اور اثر ورسوخ کا غلط فائدہ اٹھا رہی ہے۔"

"یہ اس کی ذات پر سراسر بہتان ہے۔" ابوبکر نے سختی سے تردید کی۔ "وہ اس گاؤں کے لوگوں پر ظلم و ستم ڈھا کر ان سے کیا حاصل کر سکتی ہے۔ یہاں کے لوگ غریب اور پریشان حال ہیں جس کسی نے تم سے اس عورت کے بارے میں کہا ہے وہ محض الزام ہے۔"

میں چکرا کر رہ گیا گویا ادریس الحق نے میرے ساتھ غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اس نے مجھے ایک ایسی عورت کو قتل کرنے کی ذمہ داری سونپی تھی جو بالکل بے گناہ تھی۔ صحیح صورت حال واضح ہونے کے بعد میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

کہ کیا کروں میں ایک الجھن سے دوچار ہو گیا تھا اور عجیب مخمصے میں پڑ گیا تھا۔

ابوبکر نے مجھے سوچ میں مبتلا دیکھ کر کہا۔ "گاؤں والوں کے لئے ایک بات خاصی حیرت کا باعث ہے کہ یہ عورت نہ صرف گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو بہت طرح سے جانتی ہے بلکہ گاؤں کے ایک ایک فرد کے بارے میں اس کی معلومات خیز ہیں۔ اسے ذرا ذرا سی باتوں کی خبر رہتی ہے جیسے اس نے جاسوسوں کا جال پھیلا ہو۔ وہ گاؤں کے ایک ایک فرد کا نام اور اس کے خاندانی پس منظر سے بھی بہ خوبی وا ہے۔ خدا جانے یہ ساری معلومات اس نے کہاں سے حاصل کی ہیں۔"

میری سوچ میں تلاطم پیدا ہونے لگا' مجھے ابوبکر کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ عورت کو قتل کرنا اس قدر آسان نہیں ہے جیسا کہ میں نے تصور کر لیا تھا۔ وہ اس میں کسی حکمران کی طرح شان و شوکت اور جاہ و جلال سے رہتی تھی۔ اس نے حفاظت کے لئے خونخوار کتے پال رکھے تھے کتوں کے علاوہ بہت سے مسلح محافظ بھی تھے وہ جب بھی حویلی سے باہر نکلتی اس کے ہمراہ کتوں اور محافظوں کا لشکر ہوتا تھا۔ کے لوگوں پر اس کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اس تک رسائی کسی ممکن نہ تھی۔

میرا ذہن ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گیا اس عورت کو قتل کرنے میں جان کا خطرہ تھا جبکہ اسے قتل نہ کرنے کی صورت میں بھی میرے لئے پھانسی کا پھندا تھا۔ میری جان دونوں طرف سے سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کو راہ کا انتخاب کروں۔ اگر میں ایک بے گناہ کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کامیا بھی جاتا تو میرا ضمیر زندگی بھر مجھے چین لینے نہیں دیتا لیکن اسے ختم کرنے سے دامن سے وہ داغ ضرور دھل جاتے جو مجھے جیل کی کال کوٹھری اور پھانسی کے پھن تک لے جاسکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بھاری رقم بھی میرے ہاتھ آ جاتی۔ جس ذریعے میں نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔

میرے لئے ادریس الحق کی شخصیت بھی کم پُراسرار نہ تھی۔ وہ عالیہ کا شوہر بھی ہو سکتا تھا۔ اس بات کا امکان اس لئے اور بڑھ جاتا تھا کہ عالیہ بے پناہ دولت کی مالک تھی۔ وہ عالیہ کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھ کر نکال پھینکنا چاہتا تھا کہ اس کی دولت پر قابض ہو سکے اس کے علاوہ بھی عالیہ کا اس سے کوئی اور رشتہ بھی ہو سکتا تھا جو فی الحال میری نظروں سے اوجھل تھا۔

میں دل میں ادریس الحق کی ذہانت اور منصوبے کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے لئے عالیہ کو اپنے راستے سے ہٹانا ناممکن ہو گیا تو اس نے میرا انتخاب کیا اور اس مقصد کے لئے ایک بھاری رقم مقرر کی۔ حقیقتاً اس دور میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں۔ تاہم ہر شخص کی جان بھی ارزاں نہیں ہے کم از کم عالیہ کی جان تو ارزاں نہیں تھی۔ شاید ادریس الحق کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ عالیہ کو قتل کرنا کسی پیشہ ور قاتل کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ کوئی جری سپاہی ہی یہ فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ تاہم ادریس الحق یہ بات بھول گیا کہ ایک جری سپاہی اور پیشہ ور قاتل میں فرق ہے۔ سپاہی میدان جنگ میں اپنی دھرتی کے لئے لڑتا ہے۔ اس کی اپنی کوئی غرض نہیں ہوتی ہے اور نہ وہ موت کی پرواہ کرتا ہے لیکن وہ کسی کو بے گناہ قتل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں اس فیصلے پر پہنچا کہ عالیہ کو قتل کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں بلکہ مجھے واپس ادریس الحق کے پاس پہنچ کر کسی ترکیب سے بلیک میل کرنے کا مواد اس سے حاصل کر لینا چاہئے۔

دوسرے دن میں نے ابوبکر سے گاؤں والوں اور دوستوں کے بارے میں دریافت کیا۔ چنداماں کے بارے میں بھی پوچھا جو اپنی بیٹی بانو کے ساتھ گاؤں میں رہتی تھی۔ ابوبکر نے بتایا کہ چنداماں سترہ اٹھارہ سال پہلے بیٹی کے دکھ سے مر گئی۔ بانو اپنے گناہ کا بوجھ لے کر جانے کہاں چلی گئی پھر اس روز کے بعد سے اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس کے بارے میں ایک عام خیال یہ تھا کہ شاید اس نے خودکشی کر لی۔ میں نے گاؤں والوں اور

دوستوں کے بارے میں سن کر سکون و اطمینان کا سانس لیا۔ میرے دوست زندہ تھے
بوڑھے لوگوں کی قبریں آباد تھیں میں شام تک اپنے دوستوں سے ملتا رہا اور جو بزر
زندہ رہ گئے تھے ان کی خدمت میں حاضری دی۔

رات کے کھانے کے بعد میں نے بھرا ہوا ریوالور جیب میں رکھا اور ابوبکر کو ا
میں لے کر اسے ساری کہانی سنائی۔ وہ بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ جب میں نے حویلی جانے
خیال ظاہر کیا تو وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ اس نے مجھے بہت سمجھایا کہ رات گئے میرا حویلی
طرف جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہاں کتے آزادانہ گھومتے رہتے ہیں۔ ان سے
کر حویلی میں داخل ہونا بہت مشکل ہے۔ ابوبکر کو علم نہیں تھا کہ میں اس حویلی کے
چپے چپے سے واقف تھا۔ میں نے کئی راتیں اس حویلی میں بسر کی تھیں جبکہ اس وقت دن
بھی کوئی شخص ادھر پھٹکتا بھی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے بے خوف ہو کر ادھر جانے
ارادہ کیا تھا۔

ابوبکر میرے جاں نثار دوستوں میں سے تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں نے حو
جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے اور مجھے باز نہیں رکھا جا سکتا ہے اور میں خطرہ مول لینے
لئے تیار ہوں تو اس نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا لیکن میں اسے سمجھا بجھا کر اکیلا ہی حویلی
طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے احتیاطاً ایک پنسل ٹارچ ساتھ لے لی تھی جو جدید ترین
اور اس کی روشنی بڑی بڑی ٹارچوں کی طرح تیز تھی اور بہت دور تک جاتی تھی۔
طرف اس قدر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا کہ پتہ بھی کھڑکتا تو میرے ہاتھ کی گرفت فوراً
ریوالور پر مضبوط ہو جاتی اور میں چوکنا ہو کر قدم اٹھانے لگتا۔ مجھے سب سے زیادہ کتوں
دھڑکا لگا ہوا تھا اس کے باوجود میں نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ میں پھونک پھونک کر
رکھتا جا رہا تھا اور حویلی مجھے میلوں کی مسافت پر لگ رہی تھی۔ تاہم میں بخیر و عافیت
کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔

حویلی پر گہری تاریکی اور سکوت کا راج تھا۔ گاہ بہ گاہ کسی کتے کی آواز ضرور

دے جاتی مگر پھر وہی سکوت چھا جاتا۔ میں کافی دیر تک اندھیرے میں کھڑا اندر کی سن گن
لیتا رہا تھا۔ میرے کان حویلی کے صدر دروازے پر لگے ہوئے تھے مجھے اندازہ نہیں ہو رہا
تھا کہ مسلح محافظ اس وقت کہاں ہوں گے؟ خاصا وقت گزرنے پر بھی جب کوئی آواز سنائی
نہیں دی تو میں سمجھ گیا کہ اس وقت سب گہری نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ
اس چھوٹے سے گاؤں میں انہیں کس بات کا خطرہ ہو سکتا تھا۔

میں نے پنسل ٹارچ کی روشنی میں اس مقام کا اندازہ لگایا جہاں گھنی جھاڑیاں ایک
زمین دوز راستے کو چھپائے ہوئے تھیں۔ اٹھارہ سال پہلے میں اس چور راستے سے حویلی
میں داخل ہوا کرتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں عالیہ نے وہ گزرگاہ بند نہ کرا دی ہو لیکن میرا
اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ تھوڑی دیر تلاش کے بعد مجھے جھاڑ جھنکار میں چھپا ہوا راستہ نظر آ
گیا۔

میں نے اس راستے کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے پلٹ کر محتاط انداز میں اردگرد
کا جائزہ لیا پھر میں اس راستے سے حویلی میں داخل ہو گیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا
تھا اور مجھے واضح طور پر اس کے دھڑکنے کی صدا سنائی دے رہی تھی۔

حویلی کا ماحول ایک پُراسرار اور بوجھل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ راہداریاں ویران
پڑی تھیں۔ کسی کسی راہداری میں شمعیں بھی روشن نظر آئیں۔ میں ایک تاریک
راہداری سے گزرتا ہوا اس زینے کی جانب بڑھا جو اوپر ایک خواب گاہ تک پہنچتا تھا۔ وہ
خواب گاہ بالائی منزل کے مغربی حصے میں واقع تھی اور حویلی کی دیگر خواب گاہوں سے
نسبتاً کشادہ، ہوادار اور عالیشان تھی۔ میرا خیال تھا کہ عالیہ نے اپنے لئے اسی خواب گاہ کا
انتخاب کیا ہو گا؟ میرا یہاں آنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ
عالیہ کون سی خواب گاہ استعمال کرتی ہے۔

ہرچند کہ میں اسے قتل کرنے کا خیال دل سے نکال چکا تھا تاہم میں اپنے فیصلے پر
بہت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا تھا۔ میرے دل و دماغ میں برابر ایک کشمکش سی جاری

تھی اور میرے لئے کسی حتمی فیصلے پر پہنچنا دشوار ہو گیا تھا۔ میری جان ایک بلیک میلر کے ہاتھوں میں تھی اور اس سے چھٹکارا پانے کا واحد راستہ یہ تھا کہ میں عالیہ کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ایک بار حویلی کا اچھی طرح جائزہ لے لوں اور پھر عالیہ کی خوابگاہ بھی معلوم کر لوں تاکہ جب بھی اسے قتل کرنا ناگزیر ہو جائے تو عملی قدم اٹھانے میں زیادہ دشواری اور دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

میں نے بالائی منزل کے زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ کسی کتے کی غراہٹ سنائی دی۔ میں اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ دہشت کی ایک سرد لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ بدحواسی کے باعث مجھ میں اتنی سکت بھی نہ رہی کہ پیچھے مڑ کر موت کے فرشتے کو دیکھ لوں۔ چند ثانیوں کے بعد کئی کتوں نے ایک ساتھ غرانا شروع کیا تو میں مزید دہشت زدہ ہو گیا پھر اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ کتے میری پشت پر نہیں بلکہ کسی کمرے میں بند ہیں اور میری بو سونگھ کر یا کھڑکی میں سے جھانک کر مجھے دیکھ کر غرا رہے ہیں اگر وہ آزاد ہوتے اب تک میرا تیاپانچہ ہو چکا ہوتا۔

میں نے ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کی اور پلٹ کر اس سمت دیکھا جہاں سے کتوں کے غرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک جنگلے دار کھڑکی نظر آئی۔ جنگلے کے عقب سے چار انتہائی خونخوار کتے اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ ان کی لمبی اور خوفناک زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ میں نے پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ چاروں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

یکایک انہوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ ان کے بھونکنے کے شور سے پوری حویلی گونج اٹھی چند لمحے بعد کسی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور پھر جیسے حویلی میں بھونچال سا آ گیا۔ میں سراسیمہ سا ہو کر مخالف سمت میں دوڑ پڑا۔ بدحواسی کے باوجود میں اپنی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا۔ دائیں بائیں دو تین موڑ مڑنے کے بعد میں ایک ایسی راہداری میں پہنچ گیا جہاں آمنے سامنے کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔

معاً عقب سے بھی دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا' راہداری کے آخری سرے پر دو تین آدمیوں کے دوڑتے ہوئے سائے نظر آ رہے تھے' میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔ بھاگتے بھاگتے میری ٹانگیں جیسے شل ہو گئی تھیں۔ ادھر قدموں کا شور اب بالکل ختم ہو چکا تھا۔ میں نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا اور اس پر عمل کرنے کے لئے خود کو تیار کرنے لگا۔ فی الحال بچاؤ کی یہی ایک صورت تھی۔ پھر اس سے قبل کہ بھاگتے ہوئے افراد راہداری میں داخل ہوتے' میں نہایت پھرتی سے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی میرے نتھنوں سے ایک ناگوار سی بو ٹکرائی۔ میں نے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ دوسرے ہی پل ٹارچ میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ کمرے میں ایک گرانڈیل کتا موجود تھا۔ میری رگوں میں لہو منجمد ہو گیا۔ غالباً کتا بھی میری آہٹ اور بو سونگھ کر چوکنا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں کی نگاہیں ملیں۔ وہ زنجیر سے بندھا ہوا نہ ہوتا تو مجھ پر چھلانگ لگا چکا ہوتا' میں نے فوراً ہی ٹارچ بجھائی اور بوکھلاہٹ کے عالم میں کمرے سے نکل آیا۔ دراصل میں فائرنگ کر کے اپنی موت اور مصیبت کو دعوت دینا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اس خیال سے میں کچھ خوف زدہ سا ہو رہا تھا۔ راہداری میں دو مسلح محافظ تیز تیز قدموں سے ایک سمت جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ خوش قسمتی سے ان کی پشت میری جانب تھی۔ جب وہ زینوں کی طرف مڑ کے اوجھل ہوئے تو میری جان میں جان آئی اور میں تقریباً بھاگنے کے انداز سے عقبی دروازے کی طرف چل پڑا۔

حویلی سے باہر آ کر میں نے چور راستے کو پہلے کی طرح جھاڑیوں سے ڈھک دیا۔ ضروری تھا کہ کسی کو حویلی میں میرے داخل ہونے کا احساس نہ ہو سکے۔ فرلانگ بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد جب میں میدان کے وسط میں پہنچا تو ہوا کے خوشگوار جھونکوں نے میرے اندر فرحت و تازگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ میں نے انتہائی سکون اور

سرشاری سے گہری گہری سانسیں لیں اور کچھ دیر ستانے کی غرض سے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔ میں موت کے منہ سے بال بال بچ کر آیا تھا۔ ورنہ گاؤں والوں کو ہڈیوں کا بھی نام و نشان نہ ملتا۔ دیکھا جائے تو مجھے ایک طرح سے نیا جنم ملا تھا۔ ذرا چوک ہو جاتی تو میرا جسم عبرتناک انجام کو پہنچ جاتا۔

ابوبکر میرے انتظار میں بڑی بے چینی' وحشت اور اضطراب سے ٹہل رہا تھا۔ دیکھتے ہی اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھی تھیں۔ وہ لپکتا ہوا قریب آیا اور والہانہ انداز میں مجھ سے چمٹ گیا۔ میں نے جب اسے حویلی میں پیش آنے والا سنایا تو اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ کہانی کا ایک ایک لفظ اس کے لئے سنسنی خیز ہے۔

اگلے روز صبح ہی صبح ابوبکر نے مجھے بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ کم خوابی کے میری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ جب میں نے ابوبکر کا متوحش چہرہ اور اس کی پھٹی آنکھیں دیکھیں تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میری نیند ہرن ہو گئی۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ جانے کیا ہو گیا تھا؟

میں نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے ابوبکر؟ خیریت تو ہے؟ یہ تم......

"ابھی کچھ دیر پہلے حویلی سے ایک ملازم آیا تھا۔" ابوبکر نے خوفزدہ لہجے میں "اس نے تمہارے نام یہ پیغام دیا ہے کہ پہلی فرصت میں حویلی پہنچو۔ عالیہ بیگم تم ملاقات کرنا چاہتی ہے۔"

عالیہ کا بھیجا ہوا پیغام سن کر میں اچھل پڑا یکے بعد دیگرے کئی خدشات میرے ذہن میں ابھرے۔ یہ امر کسی طرح بھی کم تشویش ناک نہ تھا کہ عالیہ نے بذات خود اپنے ہاں طلب کیا ہے۔ آخر مجھ جیسے معمولی آدمی کی اس کے نزدیک کیا حیثیت ہو تھی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ شاید رات کو مجھے کسی نے حویلی کے پاس منڈلاتے ہو۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میرا صحیح سلامت واپس آنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اصل

کچھ اور ہی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ نہ جاؤں۔ میں اس کا کوئی نوکر یا تابع تو نہیں تھا۔ چونکہ میرا اسے دیکھنا اور اس سے ملنا بے حد ضروری تھا اس لئے میں نے حویلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر میں یہ بھی تو جاننا چاہتا تھا کہ اس نے مجھے کس لئے بلایا ہے۔

ابوبکر وحشت زدگی کے عالم میں اور غالباً میرے کچھ بولنے کے انتظار میں خاموش کھڑا تھا۔ میں نے بظاہر اسے تسلی دی مگر اندر ہی اندر میری تشویش بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ایک نامعلوم خطرے کا احساس میرے لہو میں گردش کرنے لگا تھا۔ عالیہ کے ہاں میری طلبی کیا معنی رکھتی تھی؟ کہیں اسے میرے مشن کا علم تو نہیں ہو گیا ہے؟ یہ سوال کسی زہریلے ناگ کی طرح مجھے بار بار ڈسنے لگتا۔

کافی دیر کے بعد میرا خوف قدرے کم ہوا۔ اس وقت تک میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت جا کر عالیہ سے مل لینا چاہئے اس طرح کم سے کم میری الجھنیں تو دور ہو سکتی تھیں۔ میرے لئے عالیہ کی ذات ویسے بھی کسی معمے سے کم نہ تھی۔ ویسے وہ مجھے قتل کرنے سے تو رہی۔ میں تو ایک انتہائی خفیہ مشن پر آیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس ملاقات کے بعد مجھے آئندہ کے لئے لائحہ عمل مرتب کرنے میں بڑی مدد مل سکتی تھی۔ ملاقات سے پہلے طرح طرح کے خدشات کو جنم دینا فضول تھا۔

☆------☆------☆

حویلی کی طرف جاتے ہوئے میرے سینے میں دل کے دھڑکنے کی رفتار لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سورج کی تیزی اور چمکیلی روشنی میں' میں نے حویلی کی پُرشکوہ عمارت دیکھی۔ آج اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ رنگ و روغن نے اس کا حسن دوبالا کر دیا تھا اور دروازے پر دراز قد کے دو مسلح نوجوان کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر وہ تینوں کتے زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے جن سے رات میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بھونکنے اور غرانے لگے تو ایک محافظ نے انہیں خاموش کرایا۔ دوسرا محافظ تیز تیز قدموں سے اندر اطلاع کرنے دوڑ گیا۔ میں حویلی کے اندرونی حصے کا جائزہ لینے لگا۔

میرے سینے میں عجیب سی خلش ہو رہی تھی۔ ذہن طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ کئی سوال ابھرتے اور اندیشے اپنا جواز پیش کر رہے تھے۔ میری پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی اور بدن پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ میدان جنگ میں بھی کبھی میری ایسی کیفیت نہیں ہوئی تھی۔

محافظ چند لمحوں میں اسی طرح دوڑا دوڑا واپس آیا تو اس کے پیچھے ایک اور دراز قد نوجوان بھی تھا۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ لے کر اندرونی حصے کی طرف بڑھا اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کسی گونگے کی طرح خاموش رہا۔ میں اس کے ساتھ فوجی انداز سے چل رہا تھا۔ میرے اندر کا شعور خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگا۔ حویلی اب کسی محل کی طرح آراستہ ہو چکی تھی۔ لمبی سی راہداری طے کرنے کے بعد ایک زینہ آیا جو زیریں حصے کی طرف جاتا تھا۔ چند لمحے بعد میں اور وہ نوجوان ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔

اس نوجوان نے بڑے مؤدبانہ انداز سے دروازے پر مخصوص طریقے سے دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دوسرے لمحے دروازے کے ہینڈل کا لٹو پکڑ کے گھمایا۔ دروازہ اتنا کھل گیا کہ ایک آدمی اندر جا سکے۔ پھر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس نے اپنے سر کو خفیف سا خم دے کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا اس نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

میں اس کمرے کی زیبائش پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میری نگاہیں بھٹک کر ایک مرصع صوفے کے پاس کھڑے ہوئے تراشیدہ مجسمے کے سراپا پر جیسے جم کر رہ گئیں۔ اس کے بدن پر جسے چراغ جل رہے تھے۔ ایک حسین پیکر کسی قدر شاہانہ تمکنت سے میری نظروں کے سامنے موجود تھا۔ یہ عالیہ تھی۔ میں اس کے دلکش حسن اور شخصیت سے مرعوب ہو کر گنگ سا ہو گیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر حسین ہو گی اس میں کشش اس قدر تھی کہ میرے دل پر قیامت ٹوٹ پڑی لیکن وہ کسی قدر خطرناک

اور سرد مہر دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے اسے اپنے حسن و جمال پر بڑا ناز ہے۔ دولت اور امارت کا گھمنڈ ہے اس کی نگاہوں میں سازش سی جھلک رہی تھی۔

ہم دونوں کی نگاہیں آپس میں پیوست سی ہو گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے دیکھ کر مجھ پر خود فراموشی کی کیفیت کئی ثانیوں تک طاری رہی۔ اس کی شہابی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ پھر اس کی حسین اور بڑی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تیرنے لگیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے کہیں کھو سی گئی تھی۔ گم صم سی ہو گئی تھی۔ میں اس عمر میں بھی ایسی سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا کہ عورتیں مجھے ٹک ٹک دیکھنے لگتی تھیں۔ شاید اسے میری مردانہ وجاہت نے متاثر کر دیا تھا۔ میں بھی اس کے طلسم میں جیسے کھو کر رہ گیا تھا۔ واپسی کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ پھر اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اس نے مترنم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

"خوش آمدید کیپٹن صبور احمد!" میں نے اس کے لہجے میں زہر بھرا ہوا محسوس کیا تھا۔

"کیا آپ نے مجھے طلب کیا تھا؟" میں نے خوش دلی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے اپنا خوشنما سر ہلایا۔ "میں نے سوچا کہ جب آپ اٹھارہ برس کے بعد گاؤں آئے ہیں تو کیوں نہ آپ سے ملاقات کر لی جائے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "کیا آپ اس خاکسار سے واقف ہیں؟"

"کیوں نہیں؟" اس کے سرخ گداز لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ رینگنے لگی۔ میں نے متعجب ہو کر کہا۔ "میں سترہ اٹھارہ برسوں کے بعد پرسوں رات یہاں آیا ہوں۔ میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی آپ کا تعلق اس گاؤں سے ماضی میں رہا ہے۔ پھر آپ میرے بارے میں کیسے اور کس طرح سے جانتی ہیں؟"

"اس موضوع پر آپ سے کسی اور وقت بات ہو گی۔" وہ تجاہلِ عارفانہ سے بولی۔

"ویسے اٹھارہ برسوں کے بعد آپ کو اپنے گاؤں کی یاد کیسے آ گئی؟"

"گاؤں کی مٹی کی خوشبو مجھے یہاں کھینچ لائی؟" میں نے جواب دیا۔ "کوئی اپنی جگہ کو کیسے بھول سکتا ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہو۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں کیپٹن صبور احمد!" اس نے تیزی سے کہا۔ "اور جھوٹ بولنا فوجی کا شیوہ نہیں ہے۔"

"آپ کس طرح سے کہہ سکتی ہیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ مجھے بھلا اس کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے انجان بن کر کہا۔

"کیا سچ ہے کیا جھوٹ ہے یہ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم مجھے قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہو؟" اس نے استہزائی انداز سے کہا اور اس کے چہرے پر سختی آ گئی۔

اس نے جیسے میری کنپٹی پر تڑ سے ایک پتھر دے مارا تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی کو چھو گئی۔

عالیہ نے مجھے گنگ اور سکتے کی سی حالت میں پاکر سرد و سفاک لہجے میں پوچھا۔ "کیا یہ سچ نہیں ہے؟"

میں اس کے اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ اس کے علم میں سارے واقعات آ چکے تھے۔ اس سے جیسے کوئی بات چھپی نہ رہ سکی تھی۔ میں زمین میں گڑنے لگا تھا۔ مجھے اپنی موت سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ میں اب اس کے جال میں پھنس چکا تھا۔ مگر میں ابھی اس کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ "کسی نے آپ کو میرے خلاف بھڑکایا ہے۔"

"تم اپنے ارادے سے صاف انکار کر رہے ہو لیکن یہ سچ ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "یہاں تم مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنا کر آئے ہو۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ میں نے بھی تمہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ کون کامیاب اور فاتح بنتا

"آپ مجھے قتل کرنا چاہتی ہیں؟" میں بھونچکا سا ہو گیا۔ "وہ کس لئے؟ میں نے
کا کیا بگاڑا؟ میں نے کیا جرم کیا جس کی سزا آپ مجھے موت کی صورت میں دینا چاہتی

اس کا لب و لہجہ اور تخاطب کا انداز ایک دم بدل گیا۔ وہ کس قدر زہر خند سے
"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ ایک طویل اور تھکا دینے والا انتظار' اس انتظار میں
قدر کرب اور اذیت تھی کہ تم اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں کر سکتے۔ تم کھڑے
سوچ رہے ہو۔ اپنی جیب سے ریوالور نکالو جو تم نے مجھے قتل کرنے کے لئے خریدا
میرے سینے میں اس کی ساری گولیاں داغ دو۔ ایسا سنہرا موقع تمہیں پھر کبھی نہیں
گا۔"

میرے حلق میں گرہیں پڑنے لگیں۔ وہ اس قدر جذباتی ہو جائے گی میں سوچ
سکتا تھا۔ یہ ایک نئی سچویشن میرے سامنے تھی۔ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں
"میں نے قتل کا منصوبہ ترک کر دیا ہے۔"

"وہ کس لئے؟" اس نے حیرت سے اپنی لانبی لانبی پلکیں جھپکائیں۔ "یہ بات تم
لئے تو نہیں کہہ رہے ہو کہ اس وقت تم میرے رحم و کرم پر ہو اور اپنی جان بچانا
چاہتے ہو؟"

"نہیں مجھے ادریس الحق نے آپ کے بارے میں جو کہانیاں سنائی تھیں اس میں
برابر بھی صداقت نہیں ہے۔ مجھے یہاں آکر علم ہوا کہ حقیقت کیا ہے۔ میں موت
ڈرنے والا نہیں ہوں۔ اس لئے کہ موت کا ایک دن معین ہے اور میں ایک فوجی
ہوں۔"

"لیکن بد عہدی ایک سپاہی کے شایانِ شان نہیں ہوتی ہے۔" اس نے طنزیہ لہجے
کہا۔

"لیکن ایک انسان کی جان اس قدر ارزاں نہیں ہوتی ہے کہ اسے درندگی اور بربریت سے پامال کردیا جائے۔"

"لیکن اس نے تمہیں میری جان کے عوض دو لاکھ دینے کا وعدہ کیا ہے اور تم نے اسے یقین دلایا ہے کہ میری جان لے کر رہو گے۔"

"اگر وہ ایک کروڑ ٹاکا بھی دے تو میں ایک بے گناہ شخص کو قتل نہ کروں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اس خبیث شخص نے مجھے بلیک میل کیا اور ورغلایا۔ اب مجھے کسی بات کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔"

"کیا واقعی تمہارے نزدیک ایک آدمی اس قدر وقعت رکھتا ہے؟" اس کے چہرے پر ابر سا آگیا۔

میں نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ "جی بالکل۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" اس کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ "بزدل آدمی! کیا تم اپنے آپ کو موت کے منہ میں دیکھ کر جان بچانے کے لئے فریب سے کام نہیں لے رہے ہو؟" اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"میں آپ کو اپنی سچائی کا کس طرح سے یقین دلاؤں؟" میں نے کسی قدر پُرسکون لہجے میں کہا۔

"کیا تم نے کبھی اپنی زندگی میں سچ بولا ہے۔" اس نے زہرخند سے پوچھا۔

"ایک سپاہی کی زبان اور اس کا لہجہ اس کے دل کا آئینہ ہوتا ہے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"تم سپاہی نہیں بلکہ ایک مرد بھی ہو۔ دنیا کا ہر شخص چاہے اس نے کسی شخصیت میں پناہ کیوں نہ لے رکھی ہو وہ پہلے مرد ہی ہوتا ہے۔ خود غرض' فریبی......... تم صرف اپنی جان بچانا چاہتے ہو۔" وہ پھنکاری۔

"معلوم نہیں کیوں آپ کو میری بات کا یقین نہیں آرہا ہے۔ آپ کو کس طرح

اور کیسے اپنی سچائی کا یقین دلاؤں؟ کاش! سچائی ناپنے کا کوئی پیمانہ اس دنیا میں ہوتا کیا آپ اتنی سی بات نہیں جانتی ہیں کہ موت سے ڈرنے والے کبھی اپنی جان ہتھیلی پر لئے نہیں نکلتے ہیں۔ میں اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"تم مجھے فوجی کم' کسی کالج کے لیکچرار زیادہ معلوم ہو رہے ہو۔" وہ تمسخر آمیز لہجے میں بولی۔ "مجھے تمہاری سچائی کا اس وقت یقین آئے گا جب تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔"

"میں کل ہی کسی وقت یہ گاؤں چھوڑ دوں گا۔" میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پھر کبھی بھی اس گاؤں میں آنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

"بہت خوب .... میں تمہاری زبان سے یہی الفاظ سننا چاہتی تھی۔" اس کے سرخ گداز ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی بڑی سیاہ آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ "تم ادریس الحق کو اپنے مشن کی ناکامی کا سبب کیا بتاؤ گے؟ کیا عذر پیش کرو گے؟ یہ بھی تم نے سوچا ہے؟"

"اس وقت میرے ذہن میں کچھ نہیں ہے۔" میں نے بتایا۔ "میں کوئی ایسا عذر پیش کر دوں گا کہ اسے میری بات کا یقین آجائے۔ اس طرح سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔"

"کیا تم ادریس الحق کو کوئی بے وقوف شخص سمجھتے ہو؟" وہ استہزائی لہجے میں بولی۔

"میں نہیں بلکہ وہ مجھے سمجھتا ہے۔"

"تم اسے کتنا جانتے ہو؟"

"میں اسے ذاتی طور پر بالکل بھی نہیں جانتا۔ میری اس سے جو پہلی ملاقات ہوئی وہ صرف دو گھنٹے کی تھی۔ مگر میں نے یہ بات اس کے بارے میں ضرور محسوس کی کہ وہ ایک عیار اور مجرمانہ ذہن کا مالک ہے۔"

"میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتی ہوں کہ وہ کیا چیز ہے۔ وہ شاطر ذہن کا مالک

ہے' قیافہ شناس ہے۔ انسانی مجبوریوں اور نفسیاتی کمزوریوں سے خوب فائدہ اٹھانا جانتا
ہے۔ بہت اچھا اداکار ہے۔ اس کے پاس جتنی دولت ہے شاید ہی کسی کے پاس اس دیش
میں ہو۔ اس کے علاوہ وہ انتہائی بااثر' طاقتور اور بے رحم ہے۔ اس نے شاید کبھی اپنے
والدین پر بھی رحم نہیں کھایا ہو گا۔ وہ اپنے دشمن کو ایسی اذیت دے کر مارتا ہے کہ ہلاکو
اور چنگیز خان کی روحیں بھی شرما جاتی ہوں گی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بدترین
دشمن ہیں۔ اس کے ذہن میں میرے خلاف نفرت اور انتقام کے جنون کا جو زہر بھرا ہوا
ہے تم اس کا رتی بھر اندازہ بھی نہیں کر سکتے ہو۔ میں اس کے راستے کا ایسا پتھر ہوں کہ
جسے ہٹانے کے لئے وہ اپنی پوری طاقت صرف کر رہا ہے اور پیسہ ہے کہ پانی کی طرح
بہائے چلا جا رہا ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے کسی معقول جواز کو سن کر تمہاری اس
بات پر یقین کر لے گا؟ ہرگز نہیں۔"

"معقول بات ہوئی تو اسے یقین کرنا پڑے گا۔ میں اسے ہر طرح سے یقین دلانے
کی کوشش کروں گا۔ یا پھر دوسری صورت میں کہیں روپوش ہو جاؤں گا۔"

"اسے کوئی بات سمجھانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو' تم کہیں بھی چلے
جاؤ اس کے آدمی شکاری کتوں کی طرح تمہاری بو سونگھ کر تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ آج
تک کوئی بھی ان کے ہاتھ سے بچ کر کہیں جا نہیں سکا ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے میں اس کے کتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا۔" میں نے اعتماد
سے کہا۔

"اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اپنی چالاکی' ذہانت اور جرأت سے ان کے عزائم خاک میں
ملا دو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔"

"میں ایک سپاہی ہوں۔ میدان جنگ میں دشمن سے لڑ چکا ہوں۔ میں آخری
سانس تک ادریس الحق اور اس کے پالتو کتوں سے لڑوں گا۔ ان کے لئے ناقابل شکست
بن جاؤں گا۔" میں عزم و حوصلے سے بولا۔

"ادریس الحق ایک منظم گروہ کا سرغنہ ہے جو زیر زمین کام کرتا ہے۔" وہ کہنے
"میدان جنگ میں لڑنا اور بات ہے اور زیر زمین بدمعاشوں سے لڑنا اور بات ہے۔
کے گروہ میں پیشہ ور قاتل بھی شامل ہیں۔ وہ اتنے بے رحم اور سفاک ہیں کہ کسی کو
کر دینا ان کے لئے ایسا ہی ہے جیسا میرے یا تمہارے لئے راستے کے پتھر کو ٹھوکر مار
دینا۔ تم کس کس محاذ پر اس سے مقابلہ کرو گے؟ کیا تم اس بات کو بھول گئے کہ
نے تمہارا کیسا حشر کیا؟"

"جب اس کے پاس پیشہ ور قاتلوں کی کمی نہیں ہے تو اس نے آپ کے قتل کے
میرا انتخاب کس لئے کیا؟"

"شاید اس لئے کہ میں اس کے فریب میں آ جاؤں گی۔ جو قاتل بھی میرے قتل
ارادے سے نکلا اسے راستے سے ہی ناکام واپس جانا پڑا۔ کیونکہ میرے آدمیوں نے
کی ایسی درگت بنائی اور ایسا سبق دیا کہ وہ ادھر کا رخ کرنا بھول گئے۔ مجھے نہیں معلوم
ان کی تعداد کتنی تھی۔ تم نہ صرف خوش قسمتی سے زندہ بچ گئے بلکہ یہاں تک پہنچنے
کامیاب بھی ہو گئے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا ہوا تھا کہ تم زندہ سلامت
بچ نہ جا سکو۔ تمہاری لاش کسی ندی یا گڑھے میں پھینک دی جائے۔ میں نے چاروں
رف اپنا جال پھیلا رکھا ہے۔ مجھے اپنے دشمن کی حرکات و سکنات کی پل پل کی خبر ملتی
ہے۔ کوئی میری اجازت کے بغیر یہاں دم نہیں مار سکتا ہے۔ آس پاس کے بہت
علاقوں پر میری عملداری قائم ہے۔"

"آپ مجھے ادریس الحق سے کس لئے خوفزدہ کر رہی ہیں؟" میں نے اس کے
پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔

"خوفزدہ نہیں کر رہی ہوں بلکہ تمہیں بتا رہی ہوں کہ وہ کس قدر خطرناک شخص

"آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" میں نے بے پروائی سے اپنے شانے

جھٹکے۔ "میں کوئی ایسی تدبیر کرلوں گا کہ اس کی رسائی مجھ تک نہ ہو سکے۔ میں کس طرح سے اس کے زیر عتاب آنے سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہوں۔ میرے ذہن میں آرہا ہے۔ میں اس صورت میں بچ سکتا ہوں کہ گمنامی کی زندگی اپنے دیش کے کسی دور افتادہ مقام پر خاموشی سے ایک عام قسم کے آدمی کے بھیس میں گزار دوں.......... یا پھر قانونی طور پر سرحد پار کر کے کلکتہ چلا جاؤں۔ ہندوستان اتنا بڑا ملک ہے کہ اس کے کسی بھی کونے میں چلا جاؤں تو اس کے فرشتے بھی میری گرد نہیں پا سکتے۔"

"یہ تو بزدلوں کی زندگی ہوئی۔" اس نے مجھے طعنہ دیا۔ "ایک سپاہی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ چوہے کی طرح چھپ جائے۔"

"کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں واپس جا کر اس کے سینے میں ریوالور کی ساری گولیاں ایک ایک کر کے اتار دوں؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"ہاں۔" اس نے اپنا سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کی چادر تن گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک ابھری۔ "تم نے سنا ہو گا کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی آزادی کی زندگی بہتر ہوتی ہے۔ اسے قتل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ تم اسے نشانہ بنانے سے پہلے خود نشانہ بن جاؤ گے۔ اس کے لئے کوئی منصوبہ بنانا ہو گا۔"

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے اپنے دشمن کے قتل پر اکسا رہی تھی۔

"میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتی ہوں جو کسی بھی لحاظ سے گھاٹے کا نہیں ہو گا۔"

"کیسا سودا؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ادریس الحق نے تمہیں مجھے قتل کرنے کا جو معاوضہ دیا ہے میں اس کے مقابلے میں چار گنا دینے کے لئے تیار ہوں.......... یا پھر تمہی بتاؤ کہ ادریس الحق کو قتل کرنے کا کیا معاوضہ لوگے؟"

میں اچھل پڑا۔ دوسرے لمحے فوراً ہی سنبھل گیا۔ پھر میں نے بڑے پُرسکون لہجے

کسی حیرت کا اظہار کئے بغیر کہا۔ "مجھے آپ کی یہ پیشکش نامنظور ہے۔"

"وہ کس لئے؟" اس کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ "کیا لاکھوں کی رقم ہے؟"

"اس لئے کہ میں پیشہ ور قاتل نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میرے نزدیک ۔۔و غارت گری ایک وحشیانہ فعل ہے۔ آپ بیس لاکھ کی رقم بھی دیں گی تو میں اسے نہیں کروں گا۔ وہ آپ کا دشمن ہے۔ آپ خود ہی اس سے نمٹیں۔"

"مگر تم جو مجھے قتل کرنے آئے ہو کیا وہ کوئی نیک کام تھا؟" اس کے لہجے میں طنز کی ۔۔تھی۔

"میں آپ کو اس کی وجہ بتا چکا ہوں کہ مجھے بلیک میل کر کے آپ کے بارے میں بیانی سے کام لے کر مجبور کیا گیا۔ اب جبکہ آپ کی شخصیت کے اچھے پہلو سامنے آ تو میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

"میں تمہیں اس کے لئے مجبور نہیں کر رہی ہوں، میں.........."

میں نے اس کی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ لالچ تو دے رہی ہیں؟"

"میں لالچ نہیں دے رہی ہوں بلکہ ایک طرح سے مخلصانہ پیش کر رہی ہوں۔ ادریس الحق کی جان لینے کے لئے تمہیں پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ اپنی جان داؤ پر لگانا ۔ی۔ اسے قتل کرنے میں صرف تمہاری اور میری نہیں بلکہ انسانیت کی اور ملک کی ۔۔و سلامتی ہے۔ تم ہمیشہ کے لئے اس کی بلیک میلنگ سے نجات پاؤ گے۔ پھر چین و ۔ی زندگی گزار سکو گے۔ میرے انتقام کی دلی حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔ ملک و انسانیت کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ عظیم تر مقاصد کے لئے زندگی کی قربانی دینا پڑتی

"آپ انسانیت کے حیلے بہانے مجھ سے ایک پیشہ ور قاتل کا کام لینا چاہتی ہیں۔" ۔ے تیکھے لہجے میں کہا۔ "کیا پورے دیش میں صرف میں ایک ہی شخص رہ گیا ہوں

ادریس الحق کو قتل کرنے کے لئے .... کیا آپ کسی بدمعاش کی خدمات حاصل نہیں کر سکتی ہیں؟"

"نہیں .... تم غلط سمجھ رہے ہو۔ تم پیشہ ور قاتل کا نہیں بلکہ ایک سپاہی کا کردار ادا کرو گے۔ ایک ایسے شخص کو قتل کرنا جو بے ضمیر' وطن فروش اور بے رحم ہو کارِ ثواب ہے۔ میں نے بہت سارے بدمعاشوں کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن وہ لالچی' جھوٹے اور دغاباز ثابت ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف ڈبل کراس کیا بلکہ رقم بھی ہڑپ کرلی۔ کچھ تو ادریس الحق کے بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ کر اپنی زندگی سے محروم گئے۔ کچھ بک گئے۔ مجھے تم پر اعتماد ہے تم بکو گے نہیں۔"

"آپ کا بھروسہ غلط ثابت ہو سکتا ہے۔ اس وقت میں ایک ناقابل بھروسہ شخص کی شکل میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔"

"تم ناقابل بھروسہ کیسے ہوئے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ میں ادریس الحق کا آدمی ہوں۔ اس نے مجھے نہ صرف بلیک میل کے بلکہ بھروسہ کر کے آپ کو قتل کرنے کے لئے بھیجا۔ اگر میں آپ سے سودا کرلیتا ہوں تو ناقابل بھروسہ ہوا۔ جو شخص ایک سے وعدہ کر کے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا ہے وہ دوسرے کے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچا سکتا ہے۔ ایسے شخص کا کیا اعتبار؟ اگر میں آپ کے دشمن سے کوئی نیا سودا کرلیا تو........."

"مجھ میں اور ادریس الحق میں بہت فرق ہے۔" وہ مجھے سمجھانے کے انداز کہنے لگی۔ "وہ ایک مافیا تنظیم کا سربراہ ہے۔ میں اس کے برعکس وطن پرست ہوں مجھے امید ہے کہ تم ایک جرائم پیشہ کے کہنے پر نہیں چلو گے۔"

"میں کیسے یقین کرلوں کہ وہ ایک مافیا تنظیم کا سربراہ ہے؟ اس کی تنظیم سرگرمیاں کیا ہیں؟ کیا آپ بتا سکتی ہیں؟"

"وہ ایک اسلحہ فروش تنظیم ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "وہ ایسے لوگوں کے ہاتھ

فروخت کرتی ہے جو ملک دشمن عناصر ہیں۔ جو تخریبی کارروائی کرتے ہیں اور ایسی سیاسی پارٹیوں کو جو بندوق کے زور پر ملک میں تباہی لانا چاہتے ہیں۔ سیاسی اجتماعات میں' پبلک مقامات پر' ریل گاڑیوں اور سٹیمروں میں جو بم پھٹتے ہیں وہ اسی تنظیم کی کارستانی ہوتی ہے۔"

"کیا حکومت اور انٹیلی جنس کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ ملک میں تخریبی کارروائیاں کون کرتا ہے؟ کیا اس تنظیم کا آج تک ایک فرد بھی پکڑا نہیں جا سکا؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"جو لوگ پکڑے گئے انہیں جیل یا حراست کے دوران ہی قتل کر دیا گیا۔ اس لئے پس پردہ چہرہ سامنے نہ آسکا۔"

"تو آپ نے قانون کی مدد نہیں کی؟ اسے بے نقاب نہیں کیا؟"

"نہیں .... اس لئے کہ میرے پاس اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ وہ چونکہ حکومت کی نظر میں ملک کی عظیم شخصیت ہے۔ اس لئے میں آج تک اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکی ہوں۔"

"وہ آپ کو اپنے راستے کا پتھر کس لئے سمجھتا ہے؟"

"اس لئے کہ میں نے اس کی کئی ایسی لانچوں کو تباہ و برباد کر دیا جو غیر ملکی اسلحہ وطن دشمنوں کو پہنچانے کے لئے نقل و حرکت کر رہی تھیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بعض اوقات مجھے ناکامیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ جب کبھی میرے علم میں یہ بات آجاتی ہے کہ فلاں لانچ اسلحہ لے کر جا رہی ہے تو پھر اسے راستے میں تباہ کر دیا جاتا ہے۔"

"آپ کو قانون کو ہاتھ میں لینے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے حکومت کو مطلع کر دیا ہوتا۔"

"جب کبھی بھی میں نے اس کی ایسی لانچوں کی نقل و حرکت کی اطلاع پولیس کو کی

تو اسے جھوٹ سمجھا گیا۔ اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ جب میں نے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کیا تو کالی بھیڑوں نے اسے پیشگی اطلاع دے دی۔ اس نے اپنی لانچوں کو چھپا دیا یا پھر ان کا رخ تبدیل کر دیا۔ پھر میں نے تنگ آ کر اس کے خلاف محاذ بنا لیا اور اپنے تئیں اس کے خلاف سرگرم عمل ہو گئی۔"

"وہ اس قدر طاقتور اور با اثر ہوتے ہوئے بھی آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکا؟"

"اس لئے کہ میں ایک ریٹائرڈ جنرل کی بیٹی اور اس کی بیوی ہوں۔" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"بیوی؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں۔" اس نے اپنا خوشنما سر ہلایا۔ پھر وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔ "جس وقت ادریس الحق سے میری شادی ہوئی تھی وہ معمولی سا بزنس مین تھا۔ میرے نانا نے اسے میرے لئے پسند کیا تھا۔ میرے نانا نے اس کا انتخاب اس لئے کیا تھا کہ وہ بلا کا ذہین اور ایک بہت بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے اپنی دولت عیاشیوں کی نذر کر دی تھی۔ میرے کاروباری نانا نے اسے ترازو میں تولا تھا۔ اس میں اور خوبیاں جو تھیں وہ ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کے نزدیک اس کی کاروباری صلاحیتیں پیش نظر تھیں۔ وہ خود بھی بہت بڑے کاروباری اور امیر ترین آدمی تھے لہٰذا چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہونے میں دیر نہیں لگی۔ میرے نانا نے اسے کاروبار کے لئے بڑی رقم دی تو دو سال کے عرصے میں اس نے ایک بڑا بزنس مین بن کر دکھایا۔ نانا نے اپنی ساری دولت اور جائداد میرے نام کر دی تھی۔ وہ ہماری شادی کے چھ برس تک زندہ رہے۔ اس نے ان کے انتقال کے بعد لانچیں، سٹیمر اور کوچوں کی خریداری شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پورے ملک میں ٹرانسپورٹ کے کاروبار کا جال بچھا دیا۔ اس نے پدما ریور کارپوریشن قائم کر لی تھی۔

"والدین نانا کی موت کے بعد مستقل طور پر امریکہ میں آباد ہو گئے تھے۔ والدین

کی علالت کی خبر سن کر میں امریکہ گئی تو مجھے چار سال تک وہاں رکنا پڑا۔ اس نے میری کمی محسوس کی اور نہ ہی اس نے وطن آنے پر اصرار کیا تھا۔ چونکہ اس کے پاس بے پناہ دولت تھی اس لئے میری کمی دوسری عورتیں پوری کرتی رہیں۔ والدین کے انتقال کے بعد جب میں اپنے وطن آئی تو پتا چلا کہ وہ اس ملک کی بہت بڑی شخصیت بن چکا ہے۔ اس کے پاس جو دولت تھی اس کا راز یہ کھلا کہ وہ مافیا تنظیم کا سربراہ ہے۔ بین الاقوامی مافیا سے اس کا تعلق ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ وطن فروشی نہ کرے۔ آخر وہ اتنی دولت کا کیا کرے گا؟ اس نے میری ایک نہ مانی۔ پھر ہم دونوں کے درمیان فاصلے اور نفرت کی خلیج بڑھتی گئی۔ ایک روز ہمارے درمیان زبردست تلخ کلامی ہوئی۔ پھر میں اس سے الگ ہو گئی۔ پھر میں نے حکومت کے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے خلاف شکایت کی۔ انہیں بتایا کہ یہ شخص ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ وہ میری یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے ثبوت مانگا۔ میرے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ تھا۔ پھر میں نے اپنے نانا کے دوستوں کی مدد سے ایک تنظیم بنائی۔ اپنے گاؤں کے جوانوں کو بھرتی کیا۔ انہیں تربیت دلائی۔ پیشہ ور بدمعاشوں کی خدمات بھی حاصل کیں۔ میں نے اس گاؤں میں آ کر یہ حویلی خریدی اور یہاں رہائش اختیار کر لی۔ چونکہ یہ بہت محفوظ ترین علاقہ ہے۔"

وہ خاموش ہوئی تو میں نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ "میں بغیر کسی معاوضے کے آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔ آپ مجھے کہیں بھی، کبھی بھی اور کسی بھی وقت پیچھے نہ پائیں گی۔ مجھے اپنے وطن کی سلامتی اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔"

"ادریس الحق کا خاتمہ ہو جائے گا تو اس کی تنظیم بھی ختم ہو جائے گی۔ میں بیوہ ہو گی۔ مجھے سدا کے لئے آزادی مل جائے گی۔"

"کیا ادریس الحق نے آپ کو طلاق نہیں دی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "نہ میں نے اس سے طلاق کے لئے کہا ہے۔ اس

کے طلاق دینے اور میرے لینے سے ایک سکینڈل کھڑا ہو جائے گا۔ میں ایک ایسے جنرل کی بیٹی ہوں جس کی ملک اور عوام میں بڑی عزت ہے۔ اس کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ ادریس الحق ایک ایسی شخصیت کا مالک ہے جو سرکاری اور عوامی سطح پر عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ دوسری طرف میرے خون کا اس لئے بھی پیاسا ہے کہ میری کروڑوں کی دولت اور جائداد پر قابض ہو سکے۔ میری موت کے بعد اسے یہ سب کچھ مل جائے گا۔"

صورت حال اب مجھ پر روز روشن کی طرح عیاں ہونے لگی تھی۔ دراصل یہ جنگ دولت کے حصول کی تھی۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے حریف تھے۔ دونوں کے شاطر ذہن ایک سے تھے اور ان میں سے کوئی بھی کسی کو کم تر نہیں سمجھتا تھا۔ دونوں جانتے تھے کہ جنگ کا نصابی اخلاق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ فتح و شکست تقدیر کا نہیں بلکہ تدبیر کا کھیل ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے وسائل اور قوت کا اندازہ تھا لیکن اب حالات ان دونوں کو اس مقام پر لے آئے تھے کہ جہاں وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن سے زیادہ کچھ نہ تھے اور ان کی دشمنی کے اسباب صرف ذاتی رہ گئے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک زندہ رہ سکتا تھا خواہ .... وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ میرے لئے یہ اندازہ کرنا زیادہ دشوار نہ تھا کہ اب ان دونوں کے لئے زندگی کا مقصد مار دینے یا مرجانے کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے جانے کے اندیشوں میں مبتلا رہ کے جینا دونوں کی طبیعت اور تربیت کے تقاضوں کے برعکس تھا۔

یہ میں نہیں جانتا تھا کہ اس نے ادریس الحق کی بے ضمیری اور وطن فروشی کی جو کہانی سنائی ہے اس میں کتنی صداقت ہے؟ یہ من گھڑت کہانی بھی ہو سکتی تھی لیکن مجھے اس کہانی میں مبالغے کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوا تھا لیکن ابھی حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ میں بغیر کسی تحقیق کے کسی کی جان نہیں لے سکتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو کیپٹن صبور احمد؟" عالیہ کی رسیلی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

اس وقت دفعتاً میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا آپ کے آدمیوں نے ان ٹھکانوں کا پتا لگانے کی کوشش نہیں کی جہاں اسلحہ اور گولہ بارود رکھا جاتا ہے؟"

"ان ٹھکانوں کا پتا چل جائے تو پھر بات ہی کیا ہے۔" وہ بولی۔ "میرے آدمیوں اور پرائیویٹ سراغرسانوں نے سرتوڑ کوشش کرلی لیکن اس کا پتا نہ چل سکا۔ اگر ان ٹھکانوں کا پتا چل جائے تو میرے دشمن کی کمر ٹوٹ جائے گی۔"

"آپ کے نزدیک ادریس الحق کی موت زیادہ اہم ہے یا ان ٹھکانوں کی نشاندہی؟"

"ادریس الحق کی موت۔" وہ سرد و سفاک لہجے میں بولی۔

"وہ کس لئے؟" میرے منہ سے غیرارادی طور پر نکل گیا۔

"اس کی موت سے سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ اسی لئے میں اس کی موت پر بہت زیادہ زور دے رہی ہوں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "اب تمہارا یہ کام ہے کہ اس کی موت کا منصوبہ بناؤ۔ اسے کس طرح سے اور کیسے ختم کیا جا سکتا ہے اس کی تدبیر تمہیں کرنا ہے۔ تم اس مشن میں اکیلے نہیں ہو گے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گی' ہر قدم پر تمہارا ساتھ دوں گی۔ مگر میں کھل کر سامنے نہیں آؤں گی۔ میں کوشش کروں گی کہ تمہاری مدد کے لئے سائے کی طرح ساتھ لگی رہی ہوں لیکن تم میرے بھروسے میں نہیں رہنا۔ کیونکہ میرے دشمن سینکڑوں بدمعاش ہیں جو ادریس الحق کے ساتھ ہیں مجھے اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہو گا۔"

اس نے اپنی بات ختم کر کے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ ملحقہ کمرے میں بڑی شان اور تمکنت سے چلی گئی۔ جو اس کی خواب گاہ معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اسی انداز سے واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پھولا ہوا لفافہ تھا۔ اس نے لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں ایک لاکھ کی رقم ہے اسے لے لو۔"

میں نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے

کہا۔ "میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ سے کہا تھا کہ میں ایک وطن فروش کو ختم کرنے کا کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں اسے موت کی نیند سلا دوں۔"

"یہ رقم تمہارا معاوضہ نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "میں تمہیں ان اخراجات کے لئے دے رہی ہوں جو مشن کے دوران پیش آئیں گے۔ اس مشن کی کامیابی کے بعد میں تمہیں معاوضہ نہیں بلکہ ایسا انعام دوں گی جو ساری زندگی کام آئے گا۔"

اس سے باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے کھانے پر روک لیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ایک معزز مہمان جیسا سلوک کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک جنرل کی بیٹی تھی۔ اس نے اپنے باپ کا جو نام بتایا تھا وہ ایک بڑی ہستی کا تھا۔

کھانے کی میز پر اس سے باتیں بھی ہوتی رہی تھیں۔ انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بڑے اصرار سے کھلایا تھا۔ بڑے عرصے کے بعد مجھے یہاں لذیذ اور ذائقہ دار کھانے ملے تھے۔

☆------☆------☆

ابوبکر کھیتوں میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں حویلی والے راستے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ میرے لئے بہت بے چین اور پریشان ہو رہا تھا۔ اسے وسوسے اور اندیشے سانپوں کی طرح ڈستے رہے تھے۔ اس نے مجھے دور سے آتے ہوئے دیکھا تو اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے لپکتا ہوا میری طرف آیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اس نے جو سوال کئے اس کے میں نے مناسب جواب دیئے۔

میں بہت تھک گیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ میں ایک عام آدمی کی طرح سکون اور عافیت سے اپنے گاؤں میں زندگی گزاروں۔ جہاں میری زندگی پر کسی اور کا اختیار نہ رہے لیکن یہ میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ جب تک میرا مشن پورا نہیں ہو جاتا ادریس

الحق عدم آباد سدھار نہیں جاتا میں یہاں ایک دن بھی زندگی سکون سے گزار نہیں سکتا تھا۔

میں نے گھر پہنچ کر اسے اور آمنہ کو اعتماد میں لے کر عالیہ کی کہانی سنائی اور اپنے مشن کے بارے میں بتایا تو وہ دونوں بھونچکے رہ گئے۔ ابوبکر جو پولیس میں ملازمت کر کے ریٹائر ہو چکا تھا۔ اس نے عالیہ کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اس عورت نے جو کچھ کہا اس میں بڑی صداقت ہے۔ یہ آج تک پتا نہیں چل سکا ہے کہ وہ کون ہے جو تخریب کاروں کو اسلحہ فروخت کرتا ہے۔ اس نے پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کی کالی بھیڑوں کو خرید رکھا ہے وہ چوہدری کے نام سے مشہور ہے۔ چوہدری کون ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا ہے۔ وہ بہت محتاط طریقے سے کام کرتا ہے۔ وہ اس قدر ذہین اور چالاک ہے کہ اسے پولیس صحرائی لومڑی کہتی ہے۔"

"اب تو یہ پتا چل گیا کہ چوہدری اور صحرائی لومڑی کون ہے۔ عالیہ نے ان ناموں کا مجھ سے جو ذکر کیا تھا۔ میں کل ڈھاکہ جا رہا ہوں۔ پہلے تو ادریس الحق سے مل کر غلط بیانی سے کام لوں گا پھر میں اس کے خلاف کوئی منصوبہ بناؤں گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" ابوبکر نے کہا۔

"تمہیں ساتھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" آمنہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔ "بیس برس کے بعد تو تمہیں گھر میں بیٹھنا نصیب ہوا ہے کیوں اپنی جان مفت میں گنوانے لگے ہو؟"

"یہ میرا تمہارا یا صبور کا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔" ابوبکر بگڑ گیا۔ "یہ ملک کی سلامتی کا مسئلہ ہے۔ یہ ملک نہ رہا تو کچھ بھی نہ رہے گا۔ میری زندگی، میرا جینا مرنا وطن کے لئے ہے۔"

"آمنہ بھابی ٹھیک کہتی ہے۔" میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "جذباتی بنو میں دشمن سے تنہا نمٹ لوں گا مجھے اللہ پر اور اپنے بازوؤں پر پورا بھروسہ ہے۔ اگر

تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں بلالوں گا۔"

میں دوسرے دن علی الصباح ڈھاکہ شہر کے لئے روانہ ہو گیا۔ میں تمام راستے سوچتا رہا کہ مجھے ادریس الحق سے کیا باتیں کرنا ہیں۔ میرے ذہن میں جو منصوبہ آیا تھا وہ اس کے ہر پہلو کا جائزہ لے رہا تھا۔ کتنی عجیب سی بات تھی کہ اب میں ادریس الحق کے دشمن کا دوست بن کر اس کے لئے فرشتۂ اجل بن کر جارہا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس کی موت میرے ہاتھ لکھی ہے یا میری موت اس کے ہاتھ۔

جب میں پہلی بار ادریس الحق سے ملنے گیا تھا تو اس وقت میں نے اس کے حفاظتی اقدامات پر غور نہیں کیا تھا۔ ڈھاکہ پہنچ کر دوسرے دن اس سے ملنے پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ نظر نہ آنے والے حفاظتی حصار میں ہے۔ جب میں اس کے سامنے پہنچا تو وہ مجھے دیکھتے ہی غرایا۔ "تم ناکامی کی سیاہی اپنے منہ پر مل کر آئے ہو۔"

"میں بڑی مشکل سے اس کے ہاتھوں سے جان بچا کے آیا ہوں۔" میں نے اسے بدمعاشوں کے ہاتھوں پٹنے اور ایک ہفتہ تک نامعلوم مقام پر اپنی کسی محسن کے ہاں زیر علاج رہنے پھر عالیہ سے ڈرامائی اور پُراسرار ملاقات اور اس کی جان سے مار دینے کی دھمکیوں کے بارے میں بتایا۔ یہ بھی بتایا کہ میں نے کس مشکل سے وہاں سے فرار ہو کر اپنی جان بچائی۔ پھر میں نے اسے من گھڑت واقعہ بھی سنایا کہ عالیہ پر میں نے قاتلانہ حملہ کیا تھا لیکن وہ معجزانہ طور پر بال بال بچ گئی۔ اس نے مشتعل ہو کر میرے پیچھے شکاری کتوں اور بدمعاشوں کو لگا دیا تھا۔ رات کا وقت تھا میں ندی میں کود کر اپنی جان نہیں بچاتا تو اس کے کتے مجھے چیر پھاڑ کر اور اس کے پالتو بدمعاش مجھے بھون کر رکھ دیتے پھر وہ حملے کے دوسرے دن پُراسرار طور پر گاؤں سے غائب ہو گئی۔ میں نے اس کے ایک ملازم سے بات کی تو اس نے بتایا کہ عالیہ کھلنا کی طرف گئی ہے کیونکہ رات بارہ بجے اسے کھلنا شہر سے ٹیلی فون آیا تھا کہ چاٹ پورٹ سے بہت سارا اسلحہ لانچوں میں سمگل ہو کر آرہا ہے۔ وہ اسلحہ اور لانچوں کو تباہ کرنے کے لئے فوراً روانہ ہو گئی۔"

"تم اس کے تعاقب میں کھلنا کیوں نہیں گئے؟" ادریس الحق کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "تم میرے پاس چقندر جیسا منہ لے کر کس لئے آئے ہو؟"

"میں آپ کو رپورٹ دینے کے لئے آیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"تم یہ بات مجھ سے ٹیلی فون پر بھی کہہ سکتے تھے احمق!" اس نے اضطراب سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "تم اسی وقت ہوائی جہاز سے کھلنا روانہ ہو جاؤ۔ کھلنا میں میرے دفتر کے بندے رہتے ہیں۔ میں تمہیں ان کے نام پتے دے رہا ہوں ان سے ملو۔ رابطہ رکھو۔ یہ تم سے ہر طرح کا تعاون کریں گے۔ شاید دو ایک دن بعد میں بھی وہاں پہنچوں۔"

"میں دوپہر کی فلائٹ سے روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ مجھے اپنے آدمیوں کے نام پتے اور ٹیلی فون نمبر دے دیں۔"

"میں تمہیں آخری چانس دے رہا ہوں۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "اگر تم اس بار ناکام ہوئے تو پھر میں تمہاری دستاویزات قانون کے حوالے کر دوں گا۔ ایک بات یاد رکھو پھر تم عمر قید بامشقت یا پھانسی کی سزا پاؤ گے۔"

"اگر میں ناکام ہو گیا تو خودکشی کر لوں گا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "عالیہ اب میرے ہاتھ سے بچ نہ سکے گی۔"

"ناکامی کی صورت میں تمہارے لئے خودکشی ہی زیادہ مناسب ہے۔" وہ بے رحمی سے بولا۔ "اگر تم نے عالیہ کو قتل کر دیا تو میں تمہیں سرپرائز دوں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا سرپرائز کیا ہو گا۔ کامیابی اور ناکامی کی صورت میں وہ مجھے صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کرے گا۔

میں نے ایک پبلک کال آفس سے عالیہ کو ٹیلی فون کر کے ادریس الحق سے ہونے والی تمام گفتگو بتائی۔ میں نے اسے اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا۔ میں نے اس سے

یہ بھی کہا کہ میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر اپنے نشانے پر جا لگا ہے۔ غیر ملکی اسلحہ کھلنا شہر پہنچتا ہے پھر وہاں سے اسے ملک کے مختلف گوشوں اور شہروں میں پہنچایا جاتا ہے۔ ادریس الحق وہاں ایک دو دن میں کھلنا پہنچنے والا ہے۔ آپ آنا چاہیں تو آ جائیں ورنہ میں اکیلا ہی اس سے نمٹنے کی کوشش کروں گا۔ عالیہ نے مجھ سے کہا کہ میں ہوٹل ڈی لکس میں تیسری منزل کے کسی کمرے میں ٹھہروں۔

میں سہ پہر کے وقت ہوائی جہاز سے کھلنا شہر پہنچ گیا تھا۔ میں نے ہوٹل ڈی لکس کی تیسری منزل پر عالیہ کی ہدایت کے مطابق کمرہ لے لیا۔ تیسری منزل پر کمرہ کرائے پر لینے میں کیا مصلحت تھی۔ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس کی تہہ میں شاید کوئی بات تھی مجھے اس سے یوں بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ میرا مشن ادریس الحق کو موت کی نیند سلانا تھا۔

میں ہوائی جہاز میں سفر کے دوران عالیہ کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچتا رہا تھا۔ میں اب ایک پینتالیس برس کا شخص تھا رومانوی باتوں میں اب میرے لئے کوئی جاذبیت نہیں رہی تھی مگر آج میں اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کر رہا تھا مجھے اپنی کوتاہی پر پچھتاوا ہو رہا تھا کہ میں نے اپنا گھر کیوں نہیں بسایا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ عالیہ کے حسن و شباب نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ مگر اس کے بارے میں سوچنا اور اس کا خواب دیکھنا حماقت تھی۔ وہ آکاش کے سینے پر جگمگاتے ہوئے چاند کی طرح تھی جسے میں ساری زندگی چھو نہیں سکتا تھا۔ میں ذرہ تھا' وہ آفتاب تھی۔

میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا کہ میں کس جذبے کے تحت اس کے زیر اثر آ گیا۔ میں اس کے کہنے پر کیا ایک پیشہ ور قاتل کا کردار ادا نہیں کر رہا ہوں۔ میں ایک سپاہی ہوں مجھے اس طریقے سے قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے۔ قانون' قانون ہوتا ہے' وہ کبھی مجرموں کی پشت پناہی نہیں کرتا۔ پولیس کے محکمے میں نیچے سے اوپر تک ہزاروں کالی بھیڑیں کیوں نہ ہوں' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب بھی وقت ہے کہ میں جیسور شہر

چلا جاؤں وہاں سے غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے کلکتہ نکل جاؤں۔ جیسور شہر میں ایسے ایجنٹوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو معمولی سی رقم کے عوض کسی بھی شخص کو مال اسباب سمیت سرحد پار کرا دیتے ہیں۔ اس وقت میرے پاس ادریس الحق اور عالیہ کی دی ہوئی جو رقم ہے وہ لاکھوں میں ہے۔

پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ عالیہ اپنے شوہر کی دولت اور ذاتی مفاد کے لئے میدان میں نہیں کودی ہے۔ وہ اس کی موت کی خواہاں اس لئے نہیں ہے کہ ادریس الحق سے اس کا سب کچھ حاصل کر لے' اس کے سامنے ایک مقصد ہے' ایک نظریہ ہے' ایک عظیم فوجی جرنیل کی بیٹی ہونے کے ناتے وہ ملک کی سلامتی کے لئے اپنا سہاگ اجاڑنا چاہتی ہے۔ اس کے جذبے میں کہیں بھی ذاتی اغراض کی بو نہیں آتی ہے۔ اس نے کئی بار قانون سے مدد لینا چاہی لیکن قانون اس کی کوئی مدد اس لئے نہیں کر سکا تھا کہ اس کے پاس ادریس الحق کے خلاف کوئی ثبوت نہ تھا' جس نے چوہدری کی شخصیت میں پناہ لے رکھی تھی۔ میں عالیہ کی مدد کرنے کے لئے ہر طرح سے تیار تھا۔ میرے دل میں بھی وہی جذبہ موجزن تھا جو عالیہ کے دل میں تھا۔

میں نے ہوٹل میں کمرہ لینے کے بعد اپنی رقم کاؤنٹر پر جمع کرا دی۔ میں نے دس ہزار کی رقم بوقت ضرورت کے لئے جیب میں رکھ لی۔ میں ٹیکسی لے کر گھاٹ پر اس جگہ پہنچا جہاں ادریس الحق کا ورکشاپ تھا۔ اس ورکشاپ میں لانچوں' موٹر بوٹ اور سٹیمروں کی مرمت ہوتی تھی۔ اس وقت بھی دو لانچوں کے اندرونی اور زیریں حصوں میں کام ہو رہا تھا کیونکہ آوازیں آ رہی تھیں تاہم مجھے ورکشاپ کے گیٹ پر روک لیا گیا۔

گیٹ پر جو دربان تھا وہ اپنے چہرے مہرے اور وضع قطع سے پیشہ ور قاتل کی طرح لگ رہا تھا۔ اس نے سٹین گن کی نال میرے سینے پر رکھ کر مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا سخت لہجے میں بڑی بدتمیزی سے بولا۔ "کون ہے تو.........! یہاں کس لئے آیا

اس کا انداز تخاطب مجھے سخت ناگوار لگا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر میں نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ "میں ڈھاکہ شہر سے آیا ہوں مجھے ادریس الحق نے بھیجا ہے۔ مجھے ذیشان سے ملنا ہے۔"

وہ ادریس الحق کا نام سنتے ہی نرم پڑ گیا۔ اس نے ایک لانچ کے عرشے پر کام کرتے ہوئے آدمی کو بلایا۔ پھر اس سے کہا کہ ذیشان صاحب سے کہو کہ ڈھاکہ شہر سے ایک صاحب ملنے آئے ہیں۔ انھیں بڑے صاحب نے بھیجا ہے۔

وہ شخص تیزی سے لپکتا ہوا ریٹا نامی لانچ کے عرشے پر پہنچ کر زینے کی طرف بڑھا پھر نیچے چلا گیا۔ دربان نے مجھے دفتر میں لا بٹھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے سامنے ایک جلاد نما شخص کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ "بڑے صاحب نے کس لئے بھیجا ہے؟"

"یہ اطلاع دینے کے لئے کہ عالیہ بیگم کھلنا شہر پہنچ گئی ہے ہوشیار اور محتاط ہو جائیں۔"

"کیا؟" وہ بری طرح چونکا پھر سنبھل کر بولا۔ "چلو اچھا ہوا اب وہ یہاں سے بچ کر نہ جا سکے گی لیکن میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا، تم کون ہو، بڑے صاحب نے تمہارے ہاتھ یہ پیغام کس لئے بھیجا، وہ ٹیلی فون پر بھی اطلاع دے سکتے تھے؟"

"تمہارے بڑے صاحب نے عالیہ بیگم کو قتل کرنے کے لئے میری خدمات حاصل کی ہوئی ہیں۔ میں یہاں اسی لئے آیا ہوں۔ میں چونکہ یہاں آ رہا تھا اس لئے انہوں نے ٹیلی فون کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"کیا تم پیشہ ور قاتل ہو؟" اس نے تیز و تند لہجے میں پوچھا۔

"نہیں .... میں ایک ریٹائر فوجی ہوں، فوج میں کمانڈو رہ چکا ہوں۔" میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"اس کے علاوہ تمہارے ذمے کوئی اور کام سونپا گیا ہے؟" وہ مجھے گہری نظروں سے

دیکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔" میں نے سر ہلایا۔ "تمہارے بڑے صاحب نے تم سے اور توقیر اور جبار سے رابطہ رکھنے کے لئے کہا ہے تاکہ بروقت تم لوگ مجھ سے تعاون کر سکو جانے کب اور کس وقت تم لوگوں کی مدد کی ضرورت پڑ جائے۔"

ذیشان یک لخت ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر دہشت سی چھا گئی۔ وہ کچھ پریشان سا دکھائی دینے لگا۔ وہ مجھ سے تند لہجے میں بولا۔ "تم کل صبح یہاں آ کر مجھ سے مل لینا۔ میں اس وقت ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟" میں پوچھ بیٹھا۔

"چالن پورٹ۔" اس نے جواب دیا۔ "ہماری تین لانچیں ایک غیر ملکی جہاز سے امدادی سامان اتارنے گئی ہوئی ہیں جو طوفان زدگان کے لئے خلیج سے آیا ہوا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ عالیہ کے آدمی ہماری ان لانچوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ وہ شیطان عورت اب تک ہماری متعدد لانچیں تباہ کر چکی ہے اب اسے ایک بھی لانچ تباہ کرنے یا نقصان پہنچانے کا موقع کسی قیمت پر نہیں دینا ہے۔ وہ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئی ہے۔"

"کیا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کس لئے؟" اس نے چونک کر حیرت سے میری صورت دیکھی۔

"اس لئے کہ عالیہ کے آدمیوں سے مقابلہ ہونے کی صورت میں کچھ مدد کر سکوں۔" میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ رکھائی سے بولا۔ "ہمارے آدمی اس سے نمٹ لیں گے۔ اسلحہ اور آدمیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ تم جا کر یہ معلوم کرو کہ وہ کس بہروپ میں ہے اور کہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ اس کا جیسے ہی پتہ چلے اسے ختم کرنے میں ایک پل کی بھی تاخیر نہیں کرنا۔ تم پر کوئی آنچ آئی تو اسے ہم سنبھال لیں گے۔ اگر اس کے آدمی

لانچیں تباہ کر کے فرار ہو گئے تو پھر یہ سمجھو کہ تمہاری اور میری جان کی خیر نہ ہو گی۔ بڑے صاحب ہمیں مروا دیں گے۔"

اتنا کہہ کر ذیشان نے دفتر کی دیوار پر نصب ایک بٹن کو دبایا تو خطرے کا جیسا الارم بجنے لگا۔ وہ چند لمحوں تک بجتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ورکشاپ میں جو لوگ تھے اور جو لانچوں کے اندر و باہر کام کر رہے تھے وہ دوڑتے ہوئے دفتر کے اندر داخل ہو گئے وہ کوئی پندرہ سولہ افراد تھے ذیشان نے ان سے کہا کہ وہ چمپا نامی لانچ پر چلیں۔

چمپا نامی لانچ ایک طرف ڈاک کے پاس کھڑی تھی وہ لوگ تیزی سے ریٹا نامی لانچ کے عرشے سے ہوتے ہوئے اس پر سوار ہونے لگے۔ ذیشان مجھ سے ہاتھ ملا کر ان کے پیچھے ہو لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لانچ چل پڑی۔ بے حد تیز رفتار لانچ تھی جب لانچ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے دربان سے پوچھا۔ "کس کس نام کی لانچیں چان پورٹ گئی ہوئی ہیں؟"

"ستار گاؤں' آکاش اور جیون" اس نے جواب دیا۔ "ایک گھنٹے کی بات ہے وہ تینوں لانچیں وہاں سے روانہ ہونے والی ہیں۔ بڑے صاحب کی بیگم نے اپنے شوہر اور ہمارے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"اب وہ ناک میں دم کرنے کے لئے زندہ نہیں رہے گی۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ "اگر وہ کھلنا میں موجود ہے تو زندہ واپس نہیں جا سکے گی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ یہاں آتی ہے تو کس ہوٹل میں ٹھہرتی ہے؟"

"وہ ایسا بہروپ بھر کے آتی ہے کہ اسے کوئی بھی پہچان نہیں پاتا۔ وہ عورت نہیں' لومڑی ہے۔ لومڑی۔"

میں اس سے تھوڑی دیر تک گپ شپ کر کے چلا آیا۔ اس سے میں نے غیر محسوس انداز سے کچھ معلوم کرنا چاہا مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ وہ ایک کائیاں شخص تھا البتہ اس نے بتایا کہ اس ورکشاپ میں صبح سات بجے سے شام چھ بجے تک کام ہوتا ہے۔

پرانی لانچوں کو خرید کر اندر سے ان کی مرمت کی جاتی ہے لیکن جو لانچیں وہاں کھڑی تھیں جن میں کام ہوا تھا وہ کسی بھی طرح پرانی نہیں لگ رہی تھیں۔ جب ان کی ظاہری حالت بہت اچھی تھی تو اندر کی حالت' بھی اچھی ہو سکتی تھی۔ اس طرح دو تین موٹر بوٹس پر بھی کام ہو رہا تھا۔ ڈاک پر جو تختے پڑے ہوئے تھے وہ موٹی اور بے حد مضبوط لکڑی کے تھے۔ میرے دل میں شک کی ایک لہر اٹھی میں نے دربان سے پوچھا کہ کیا میں اندر سے ان لانچوں کو دیکھ سکتا ہوں۔ اس نے سختی سے منع کر دیا۔ پھر میرے دل میں شک کی لہر پختہ یقین میں تبدیل ہو گئی۔ دال میں کالا ہی کالا تھا۔

میں نے ایک پبلک ٹیلی فون سے کوسٹ گارڈ کے دفتر ٹیلی فون کیا۔ آپریٹر نے یری ایک افسر سے بات کرا دی۔ وہ ایک ریٹائر فوجی کرنل تھا میں نے اسے بتایا کہ ستار اؤں' آکاش اور جیون نامی لانچوں میں ایک غیر ملکی جہاز سے غیر قانونی اسلحہ لایا جا رہا

وہ لانچیں تھوڑی دیر کے بعد چان پورٹ سے روانہ ہو کر کھلنا کی طرف آنے والی ں۔ امدادی سامان سرکاری گوداموں کے ٹرمینل پر اتار کر کہاں جائیں گی میں یہ بتا نہیں تا کیونکہ انہیں ان کی ایک حریف تنظیم سے خطرہ ہے کہ وہ ان کی لانچوں کو تباہ نہ کر ے ان کی حریف تنظیم اب تک ان کی متعدد لانچوں اور موٹر بوٹوں کو تباہ و برباد کر چکی ہے۔ اس چمپا نامی لانچ میں پندرہ سولہ پیشہ ور بدمعاش بندوقوں اور مشین گنوں سے مسلح

کرنل نے میرا شکریہ ادا کیا اور میرے اس جذبے کو سراہا کہ میں نے ایک عام کی حیثیت سے قانون سے تعاون کیا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ ان میں سے کوئی قانون کے ہاتھوں سے بچ نہ سکے گا۔ وہ فوراً ہی چان پورٹ کی طرف روانہ ہو رہا ۔ مجھے کرنل سے بات کر کے بہت خوشی ہوئی تھی۔ فوجیوں کو خریدا نہیں جا سکتا۔ وہ بڑ' اصول پسند اور وطن پرست ہوتے ہیں۔ ایک مجرم کتنا ہی بااثر اور طاقتور کیوں نہ

ہو وہ اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے جھجکتے یا خوف نہیں کھاتے۔

میں بیدار ہوا تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ میں نے اس وقت کوسٹ گارڈ کے دفتر میں کرنل کو ٹیلی فون کیا۔ کرنل کوئی ایک گھنٹہ پہلے ہی اپنے دفتر کی کارروائی مکمل کر کے پہنچا تھا۔ اس نے میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ ان چاروں لانچوں کو بیچ سمندر میں روک کر ان پر چھاپہ مارا گیا۔ کسی بھی لانچ سے ایک ریوالور تک برآمد نہ ہو سکا۔ چمپا نامی لانچ میں پندرہ سولہ آدمی ضرور تھے لیکن ان کے پاس سے ایک چاقو تک نہیں نکلا۔ تینوں لانچوں پر امدادی سامان لدا ہوا تھا۔ امدادی سامان کی بھی جانچ پڑتال کی گئی ان میں سے کوئی قابل اعتراض چیز نہیں نکلی۔ آپ کی اطلاع جھوٹی ثابت ہوئی آئندہ آپ مصدقہ اطلاع دیا کیجئے۔

کرنل کی جگہ کوئی پولیس افسر یہ بات کہتا تو مجھے اس کی بات کا بالکل یقین نہیں آتا مگر مجھے کرنل کی بات کا یقین کرنا پڑا۔ اسلحہ نہ ملنا حیران کن بات تھی اور میری سمجھ سے بالاتر بھی۔ دربان نے مجھ سے کہا تھا کہ چمپا نامی لانچ میں جدید ترین ہتھیار موجود ہیں جس سے لانچوں اور بڑے سٹیمروں کو بھی شدید نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ورکشاپ میں کام کرتے ہیں وہ کوئی عام مزدور نہیں ہیں وہ نہ صرف میکینک ہیں بلکہ تربیت یافتہ ہیں اور ہر قسم کا اسلحہ چلانے میں مہارت رکھتے ہیں' میں بھونچکا رہ گیا کہ وہ اسلحہ کہاں گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں لانچوں میں کسی ایسی جگہ چھپا دیا گیا جہاں سے کوئی برآمد نہ کر سکے اگر ایک بندوق ہو تو ایسا ممکن تھا لیکن اسلحے کی کھیپ کو چھپانا آسان نہیں تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کوسٹ گارڈ میں ایک سے ایک کائیاں افسر موجود تھا بھی دھوکا کھا گئے تھے۔

غالباً دو باتیں ہوئی تھیں پہلی بات تو یہ تھی کہ کسی ممکنہ خطرے کے باعث اسلحہ لانچوں کے ذریعے پہلے ہی روانہ کر دیا گیا تھا پھر اسے جہاز سے اتارا ہی نہیں گیا۔ یہ بات بھی ہو سکتی تھی کہ اسلحہ سمندر میں اتار دیا گیا ہو اور سمندر کے اندر سے ہی اسے کم

محفوظ جگہ پر پہنچا دیا گیا ہو۔ شاید اس تنظیم نے ایسے افراد کی خدمات حاصل کر رکھی تھی جو سمندر کے اندر ہر قسم کے کام انجام دے سکتے ہوں۔ اس جدید دور میں کوئی بات ناممکن نہیں تھی۔

میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح اس بات کا پتا لگا کر رہوں گا کہ اسلحے کی یہ کھیپ ہے کہاں؟ اسے کیسے کس طرح اور کن لانچوں کے ذریعے کہاں لے جایا گیا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ میں کیوں اس پھڈے میں اپنی ٹانگ اڑا رہا ہوں۔ میرا مشن صرف اور صرف ادریس الحق کو قتل کر کے اس سے نجات پانا ہے اور عالیہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرنا ہے مگر میرے اندر ایک ضد سی پیدا ہو گئی تھی ادریس الحق نے مجھے جو اذیت پہنچائی تھی میں بھی اسے ایسی اذیت پہنچانا چاہتا تھا۔ پھر اسے قتل کرنا چاہتا تھا اسے اذیت اس طرح پہنچائی جا سکتی تھی کہ اسلحے کی کھیپ پکڑوا دی جائے۔

میں تیار ہو کر اور ناشتہ کر کے ادریس الحق کے ورکشاپ پہنچا تو صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے اس کے ڈاک پر تین لانچوں کو لنگر انداز دیکھا۔ یہ وہی لانچیں تھیں جو حکومت کا امدادی سامان لانے چاں پورٹ گئی ہوئی تھیں وہ سامان اتار کے ڈاک پر کھڑی تھیں۔ کل جن لانچوں کے اندر کام ہو رہا تھا ان میں آج بھی ہو رہا تھا۔

دربان نے مجھے ذیشان سے ملنے لانچ پر جانے نہیں دیا۔ اس نے دفتر ہی میں روک لیا اور ایک آدمی کو بھیج دیا کہ وہ ذیشان کو بلا لائے۔ کوئی دس بارہ منٹ کے بعد ذیشان آیا۔ میں نے اس دوران دربان سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ اس قدر سرد مہری سے پیش آیا جیسے اسے شک ہو گیا ہو کہ میں عالیہ کا کارندہ ہوں۔ ذیشان آیا تو بہت خوش تھا اس نے مجھ سے بڑی گرم جوشی اور تپاک سے ہاتھ ملایا میں نے اس سے پوچھا۔ "رات خیریت رہی نا؟ عالیہ کے آدمیوں نے کوئی حرکت تو نہیں کی؟"

"خیریت کہاں تھی۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "عالیہ نے اپنی پوری کوشش کر لی تھی کہ اسلحہ برآمد ہو جائے کرنل نے بہت بھاری جمعیت کے ساتھ چھاپہ

مارا تھا۔ اسے ایک پستول بھی نہیں ملا۔ وہ اپنی منہ کی کھا کر رہ گیا تھا۔"

"تو گویا اسلحہ لانچوں میں نہیں تھا۔" میں نے ظاہری طور پر خوشی کا اظہار کیا۔ "یہ بہت اچھا کیا کہ ان لانچوں میں اسلحہ چڑھایا نہیں گیا ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے اور یہ شیطان عورت جشن منا رہی ہوتی۔"

"اسلحہ کیوں نہیں تھا۔" وہ اپنی رو میں بڑے پُرجوش لہجے میں بول گیا۔ "ان لانچوں میں اسلحے کی بڑی کھیپ موجود تھی۔ مگر اسے ان کے فرشتے بھی نہیں ڈھونڈ سکتے تھے ہم ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکال لائے۔ عالیہ نے ہمیں جو پھانسنے کی کوشش کی تھی وہ بُری طرح ناکام ہو گئی۔ وہ اپنی ذلت آمیز شکست پر جل کڑھ رہی ہو گی۔"

"آپ لوگوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ مبارک ہو۔" میں نے اسے مبارکباد دینے کے بعد موضوع بدلا۔ "کل شام یہاں سے جانے کے بعد میں نے عالیہ کو تلاش کرنے کی بڑی کوشش کی مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔"

"اپنی تلاش جاری رکھو۔" اس نے مجھے ناصحانہ انداز میں کہا۔ "وہ اپنی شکل کی نمائش کرنے سے رہی۔ وہ کسی بدصورت عورت کے بہروپ میں ہو گی۔ شاید کسی فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہری ہو گی اکیلی ہو گی۔"

"میں کل رات ہوٹلوں کی خاک چھانتا رہا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اس وقت بھی اس کی تلاش میں جا رہا ہوں تمہیں اور تمہارے آدمیوں کو کہیں دکھائی دے جائے تو مجھے ہوٹل ڈی لکس ٹیلی فون کر لینا میرے نہ ہونے کی صورت میں کوئی پیغام چھوڑ دینا۔ ہاں......... بڑے صاحب کب تک آ رہے ہیں؟"

"تم بڑے صاحب کی نہیں اس شیطان کی خالہ کی فکر کرو۔" اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ وہ خشونت سے بولا۔ "میں نے شاید پہلے بھی تم سے کہا ہے کہ وہ زندہ رہے گی تو ہم زندہ نہیں رہیں گے۔"

میں اس کے دفتر اور ورکشاپ سے نکل کر ٹرمینل کے ایک کونے میں بنے ہوئے کینٹین میں آ کر بیٹھ گیا میں دل میں ششدر تھا کہ لانچوں میں اسلحہ کی اتنی بڑی کھیپ موجود تھی پھر بھی کرنل کے ہاتھ نہیں لگی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ میں جتنا سوچتا جا رہا تھا اتنا ہی چکراتا جا رہا تھا۔ پھر میرے دل میں شک کی لہر اٹھی کہیں کرنل بھی ان لوگوں کا خریدا ہوا تو نہیں ہے؟ مگر میرا دل یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ کرنل بک سکتا ہے۔

دفعتاً ایک خیال بجلی کی طرح ذہن میں آیا۔ ممکن ہے کہ اسلحے کی کھیپ لانچوں ہی میں موجود ہو' اسے کسی وجہ سے نکالا نہیں گیا ہو اسے شاید کسی مناسب وقت نکالا جائے گا یہ کھیپ کسی ایسے حصے میں خوبصورتی سے چھپائی گئی ہو گی کہ کسی کی نظر نہ پڑ سکے اور خیال نہ جا سکے اور پھر انہیں اسلحہ نکالنے کی جلدی بھی نہ ہو گی۔ وہ شاید اسلحہ وصول کرنے والوں کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ شاید رات کے وقت ان لانچوں سے اسلحہ نکال کر دوسری لانچوں میں منتقل کیا جائے۔

میں نے ہوٹل جانے سے پہلے ٹرمینل کے باہر ایک دکان سے ایک طاقتور ٹارچ خریدی پھر ایک دکان سے شکاری چاقو خریدا' پھر میں ہوٹل آیا۔ میں نے خریدی ہوئی چیزیں اپنے کمرے میں لے جا کر رکھیں۔ لنچ کا وقت ہو رہا تھا میں لنچ کرنے کے لئے اپنے کمرے سے نکلا۔ اس وقت کوئی چار پانچ مرد اور عورتیں بھی اپنے اپنے کمروں سے نکلیں۔ ان میں دو جوڑے تھے ہم لوگ ایک لفٹ میں سوار ہو گئے کیونکہ دوسری لفٹ مصروف تھی۔

میرے قریب جو عورت کھڑی تھی وہ سفید ساڑھی اور بغیر آستینوں والے بلاؤز میں ملبوس تھی۔ اس کے سر کے تمام بال بھی سفید تھے۔ اس کا چشمہ بھی سفید تھا۔ اس کی رنگت اور چرمی پرس بھی سفید تھا۔ وہ سرتاپا سفید ہی سفید تھی۔

وہ میرے قریب کھڑی تھی۔ اس کی عمر ساٹھ برس سے کم ہو گی لیکن وہ ایک

صحت مند' تندرست توانا اور چاق وچوبند عورت تھی۔ وہ جوانی میں قیامت رہی ہو گی۔ آج بھی اس کی آنکھیں بہت خوبصورت اور نشیلی تھیں۔ میں اس کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے ایک دم چونک پڑا تھا۔ وہ کسی اور طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے فوراً ہی تاڑ لیا تھا کہ عمر کی نقاب ایک دھوکا ہے جب وہ لفٹ سے نکل کر ڈائننگ ہال کی طرف بڑھی تو اس کی چال کسی جوان لڑکی جیسی تھی۔ میک اپ کے باوجود ہاتھ نرم و نازک تھے اور کسی عمر رسیدہ عورت کے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ بالوں کی سفیدی بھی مصنوعی تھی' میرے جیسے زمانہ شناس شخص کے لئے اصلی اور نقلی چہروں کے فرق کو معلوم کر لینا ایک معمولی بات تھی۔

وہ جس میز پر جا بیٹھی میں بھی اس سے اجازت طلب کر کے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ویٹر نازل ہوا تو اس سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد آئے۔ ویٹر چلا گیا تو میں نے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔ "عالیہ بیگم! آپ کا میک اپ کس نے کیا ہے؟ جزئیات کا ذرا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔"

عالیہ بھونچکی سی ہو گئی۔ "ایں.......... تم نے مجھے پہچان لیا؟"

"میں کیا دشمن بھی آپ کو بڑی آسانی سے پہچان سکتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ فوراً اپنے کمرے میں جائیں اور لنچ وہیں منگوالیں۔ تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر کے بعد میں اس کے کمرے میں پہنچا تو اس نے پوچھا۔ "تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟"

"صرف بالوں کی سفیدی سے عمر نہیں چھپ جاتی ہے۔" میں کہنے لگا۔ "آپ نے سفید بالوں کی وگ سے ساٹھ برس کی عورت کا بہروپ بھرا ہے اور چہرے میں تبدیلی کرلی ہے لیکن چہرے پر شکن تک نہیں ہے۔ چال سے ہاتھوں سے اور آنکھوں سے آپ ایک جوان عورت کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ ادریس الحق کے آدمی آپ کو چند لمحے بغور دیکھنے کے بعد پہچان سکتے ہیں۔"

"میں پہلی بار بہروپ بھر کے نکلی ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سنگھار میز کے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اپنے آپ کو چند لمحوں تک تنقیدی نظروں سے دیکھتی رہی' پھر واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "میں نے ان باتوں پر غور نہیں کیا تھا۔ بہرحال خطرے کی کوئی بات نہیں۔ میرے دو محافظ سامنے کمرے میں اور دو محافظ نیچے موجود ہیں۔ اب تم بتاؤ۔ کیا ادریس الحق کھلنا پہنچا؟"

"نہیں۔" میں نے سرہلایا پھر میں نے کم سے کم الفاظ میں اسے روداد سنائی۔

"یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلحے کی ایک بڑی کھیپ ان تین لانچوں میں چھپائی گئی ہو اور وہ نظر نہ آسکے۔" عالیہ بھونچکی ہو کر بولی۔ "تم اس بات سے اتنا اندازہ کر سکتے ہو کہ کس قدر کرپشن ہے لوگ کس قدر بکے ہوئے ہیں۔ وہ کس قدر بااثر اور طاقتور ہے۔ اس لئے تو میں حکومت کی کسی ایجنسی پر بھروسہ نہیں کرتی اس لئے کسی نہ کسی طرح انہیں تباہ کر دیتی ہوں۔ میں آج ہی اپنے آدمیوں کو حکم دیئے دیتی ہوں کہ وہ ان چاروں لانچوں کو ڈبونے کی کوشش کریں۔"

"انہیں ڈبو دینے میں آپ ہی کا نقصان ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"میرا نقصان' وہ کیسے؟"

"اس لئے کہ کل آپ ان لانچوں کی مالک بننے والی ہیں۔ یہ آپ کی ملکیت ہوں گی۔"

"مجھے دولت کی ذرا بھی ہوس نہیں ہے میں اپنے خبیث شوہر کو اس قدر نقصان پہنچانا چاہتی ہوں کہ وہ ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جائے۔ اب بھی وہ بڑے کرب سے دوچار ہے۔ مجھے دولت سے زیادہ وطن کی سلامتی عزیز ہے۔"

"کرنل کے بارے میں آپ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ غلط ہے میں آج رات پتا چلانے کی کوشش کروں گا کہ لانچوں میں اسلحہ کہاں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ یہ کارگو لانچیں ہیں۔ ادریس الحق کی جتنی بھی لانچیں اور موٹر بوٹس ہیں وہ کارگو کے لئے کم سمگلنگ کے

لئے زیادہ استعمال کی جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے ان میں تبدیلی بھی کی جاتی ہے۔"

"میں نے ایک مسافر سٹیمروی وی لیلی' جمیلہ کے فرضی نام سے کرایہ پر لیا ہوا ہے اور وہ گھاٹ سے ایک میل کے فاصلے پر لنگر انداز ہے۔ میں اپنے محافظوں کے ساتھ آئی ہوں۔ میں اب یہاں سے واپس سٹیمر میں جا رہی ہوں۔ اس حلئے میں میرا یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے تم ان لانچوں کو رات کو جا کر چیک کر لینا۔ پھر مجھے رپورٹ دینا۔ لانچوں میں اسلحہ ہو یا نہ ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ میں نے اس کے ورکشاپ کو نذر آتش کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے' نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

"کیا؟" میں بھونچکا سا ہو گیا۔

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" اس کی آنکھوں میں سفاک چمک کوند گئی۔

"تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اس نے کلکتہ کے ایک پیشہ ور قاتل دھنو کی خدمات میرے قتل کے لئے حاصل کی ہوئی ہے۔ وہ مجھے قتل کرا کے ایک فلمی اداکارہ سے شادی کرنا چاہتا ہے جو آج کل فلمی افق پر چمک رہی ہے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کی جتنی لانچیں' سٹیمر اور جہاز ہیں انہیں نذر آتش کر دوں' اس کا ایک اور ورکشاپ چٹاگانگ شہر کے ساحلی علاقے میں ہے اسے بھی نشانہ بناؤں گی۔"

"آپ اس قدر جلد بازی سے کام نہ لیں اور جذباتی نہ ہوں۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم نہیں جانتے ہو کہ دھنو کیا چیز ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "وہ انتہائی خطرناک مجرم اور پیشہ ور قاتلوں کے ایک منظم گروہ کا سرغنہ ہے۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ یہ شخص اب تک کس کس کو ٹھکانے لگا چکا ہے اور ہر ایک کی موت کا کتنا معاوضہ وصول کر چکا ہے۔ جرائم کی نوعیت اور مناسبت سے تو اسے دس بار زندگی ملتی تو شاید دس مرتبہ عمر قید کے بعد سزائے موت بھی کم ہوتی۔ اس نے پانچ سال کی قید کاٹی تھی وہ بھی چار قسطوں میں......... وہ اپنے شکار کو گولی نہیں مارتا اور نہ چاقو اس کے سینے میں اتار کر ہلاک کرتا

ہے بلکہ انتہائی درندگی اور بربریت سے آدمی کو ذبح کر دیتا ہے۔ اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ وہ کس قدر شقی القلب شخص ہے۔ میرا خبیث شوہر متعدد بار اس کی خدمات حاصل کر چکا ہے۔ شکار کبھی اس کے ہاتھ سے بچ نہیں سکا ہے۔ ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"صبر۔" میں نے جواب دیا۔ "اسے آپ تک رسائی حاصل کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ سخت حفاظتی اقدامات کی وجہ سے وہ آپ کا بال تک بیکا نہیں کر سکے گا......... کیوں نہ ہم دگنے معاوضے پر اس کی خدمات حاصل کر لیں اور اس سے کہیں کہ وہ یہاں سے چلا جائے یا پھر آپ کے شوہر کو ختم کر دے۔"

"وہ ایک بار جس سے سودا کر لیتا ہے اس پر قائم رہتا ہے۔ اس معاملے میں وہ بڑا اصول پسند ہے۔" عالیہ بیگم نے کہا۔

"ادریس الحق ایک دو دن میں ہی یہاں آنے والا ہے اس کے یہاں آتے ہی میں اس سے نمٹ لوں گا اگر میں کسی وجہ سے ناکام ہو گیا تو پھر ہم سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔

دفعتاً تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ عالیہ بیگم نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

"ویٹر!" باہر سے ایک ٹھہری ہوئی آواز نے جواب دیا۔

میری چھٹی حس فوراً بیدار ہو گئی مجھ خطرے کی بو آنے لگی۔ میں نے عالیہ سے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔ "خطرہ؟"

"خطرہ؟" عالیہ نے متعجب ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا اس نے میرے اشارے کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

"تم اتنی جلدی کیوں آئے ہو؟ میں نے تو ابھی کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔"

"میڈم! تھوڑی دیر پہلے تازہ ہلسا (پلا) مچھلی آئی تھی۔ وہ میں فرائی کروا کے لایا ہوں۔" اس نے کہا۔ "ہمارے ہاں کی فرائی مچھلی پورے دیس میں مشہور ہے۔ پلیز آپ ٹیسٹ کر کے دیکھیں۔"

"ہلسا مچھلی؟" عالیہ کے منہ میں پانی بھر آیا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے دروازے کی طرف لپکی تو میں نے فوراً ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ عالیہ نے مجھے حیرت سے دیکھا تو میں ٹوائلٹ کے دروازے کی طرف لپکا اور اپنے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا' میں نے ٹوائلٹ میں داخل ہو کر اس کا دروازہ اتنا کھلا رکھا کہ اس میں ایک جھری سی بن گئی اور وہ کھلا ہوا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس کی لائٹ کا سوچ آن نہیں کیا۔ فوراً ہی جیب سے اپنا ریوالور نکال لیا۔

عالیہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا ویسے ہی وہ فرش پر آ رہی۔ کسی نے فوراً ہی اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ داخل ہونے والے نے دروزہ اندر کی طرف پوری طاقت سے دھکیلا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی تھی پھر وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ "دھنو! تم؟" وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا لباس درست کرتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگی۔

دھنو اس تیزی سے عالیہ کی طرف بڑھا تھا کہ میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ ایک دراز قد اور بے حد صحت مند جسم کا مالک تھا۔ اس کے ہاتھ میں سائیلنسر لگا پستول تھا۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ باہر نکل کر یا اندر سے ہی اس پر فائر کر دیتا۔ میں فائر یوں بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میرے ریوالور میں سائیلنسر لگا ہوا نہیں تھا۔ فائرنگ کرنے سے ہنگامہ کھڑا ہونے کا خدشہ تھا میں چاہتا تھا کہ سانپ بھی مر جائے لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے۔

"تم......... کس لئے آئے ہو؟" عالیہ کی زبان لڑکھڑائی۔

اس نے کوئی جواب دیئے بغیر ٹیپ اور پستول اس میز پر رکھ دیا جس پر کھانا چنا ہوا

تھا۔ دوسرے لمحے مجھے اس کے ہاتھ میں آٹھ انچ لمبے دو دھاری چاقو کی چمک نظر آئی۔ میں اس مہلک ہتھیار کو پہچانتا تھا۔ مجھے اس کا پھل زہر بھرا ہوا لگ رہا تھا۔

"دھنو!" عالیہ کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ "کیا تم مجھے بھی ذبح کرو گے؟"

"ہاں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے سرد اور سفاک لہجے میں جواب دیا۔ "آپ کے شوہر کا یہی حکم ہے کہ میں آپ کو بھی روایتی انداز میں قتل کروں......... وہ آپ کا سر تن سے جدا دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"دھنو......... دھنو........." عالیہ گڑگڑائی۔ اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ "خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو......... میں تمہاری ہر بات........." وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی اور غش کھا کر فرش پر گر پڑی۔

دھنو نے میز سے ٹیپ اٹھایا۔ اس میں سے دو تین انچ کا ٹکڑا کاٹ کر عالیہ کی طرف بڑھا۔ وہ فرش پر اس کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گیا تاکہ اس کے منہ پر ٹیپ چپکا سکے۔ وہ جیسے ہی اس کے منہ پر ٹیپ چپکانے کے لئے جھکا میں ٹوائلٹ کا دروازہ کھول کر نکل آیا۔ مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ میں اس کی طرف تیزی سے بڑھا۔ وہ میری آہٹ پا کر چونکا اور پلٹ کر دیکھا میں نے اپنا ریوالور اس کے سر پر پوری قوت سے کھینچ مارا۔ ریوالور اس کی کھوپڑی پر لگا تو وہ اس کی ضرب نہ سہہ سکا۔ ایک دم چکرا کر فرش پر گر پڑا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور عالیہ کے قریب ہی پڑا تھا۔ میں نے اپنا اطمینان کرنے کے بعد اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اسے گھسیٹنے لگا۔ اسی وقت عالیہ کو ہوش آ گیا۔ اس نے اپنا سر جھٹک کر دھنو کو بے ہوش اور مجھے اسے گھسیٹتے دیکھا تو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دیوار کے سہارے کھڑی ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

"اف میرے خدا! کیا میں زندہ ہوں۔" وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "کیا یہ خبیث مر گیا ہے؟"

"نہیں' بے ہوش ہو گیا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "میں نے ریوالور کا دستہ اس

کی کھوپڑی پر دے مارا جس سے یہ بے ہوش ہو گیا۔"

"تم نے اسے قتل کیوں نہیں کر دیا؟ ریوالور کہاں ہے؟ اسے قتل کر دو۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

"اسے قتل کرنا مناسب نہیں ہو گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"کیوں آخر؟" وہ غصے سے بولی۔

"قانون کو ہاتھ میں لینا کسی طرح مناسب نہیں ہو گا اور پھر اسے قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو ٹھکانے لگانا بہت مشکل ہو گا۔ ہم پولیس کو اطلاع کر دیں گے۔ پولیس اسے فوراً اپنی حراست میں لے لے گی۔ کیونکہ یہ غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوا ہو گا اور یہ ایک پیشہ ور مشہور بد معاش ہے۔ پولیس تو اسے اچھی طرح جانتی ہو گی؟"

"ہاں .... پولیس اسے بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ یہ کئی کیس میں پولیس کو مطلوب ہے۔" وہ بولی۔

میں نے عالیہ سے کہا۔ "بس اب آپ چل پڑیں اپنا سامان لے لیں۔"

عالیہ نے الماری سے اپنا بریف کیس نکالا۔ وہ میرے پاس آ کر میرا چہرہ نظروں کی گرفت میں لے کر بڑی ممنونیت سے بولی۔ "میرے پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔"

"کس بات کا شکریہ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"جان بچانے اور ایک نئی زندگی دینے کا۔" اس نے رسیلی آواز میں جواب دیا۔ "تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں تمہارا احسان اتارنا چاہوں تو اتار نہیں سکوں گی۔"

میں نے کہا۔ "میں نے ایک انسانی فرض ادا کیا ہے۔ اس میں شکریے اور احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔ جب ایک سپاہی میدان جنگ میں ملک اور قوم کے لئے لڑ سکتا ہے تو کیا وہ ایک جان نہیں بچا سکتا۔"

میں اتنا کہہ کر دروازے کے پاس پہنچا۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری سنسان اور ویران پڑی تھی۔ میں نے عالیہ کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر آ کر تیزی سے لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ لفٹ میں سوار ہو گئی تو تھوڑی دیر کے بعد میں دوسری لفٹ سے نیچے آیا۔ پھر میں نے عالیہ کو اپنے آدمیوں کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ وہ پچھلی نشست پر ٹھس ٹھسا کر بیٹھ گئے تھے۔

☆------☆------☆

میں رات دس بجے پوری تیاری سے ہوٹل سے نکلا پھر ٹیکسی کر کے گھاٹ پہنچ گیا۔ ورکشاپ اور اس کے باہر کھڑی ہوئی تمام لانچیں اور موٹر بوٹیں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ دفتر کے اندر دھیمی سی روشنی ہو رہی تھی۔ دربان شاید جاگ رہا تھا۔ میں اندھیرے کی پناہ میں دفتر کی طرف بڑھنے لگا پھر میں قریب پہنچ کر ٹھٹک گیا اور جلدی سے اپنے آپ کو ستون کی آڑ میں چھپا لیا۔ دفتر کے کمرے سے دو سائے باہر آئے تھے۔ دفتر کی روشنی گل ہو گئی تھی اس میں ایک سایہ عورت کا تھا وہ کہہ رہی تھی۔ "میرے گھر چلو۔"

"رات کے وقت جانا مناسب نہیں ہے۔ صاحب کو یا مینجر کو پتا چل گیا تو میری نوکری کی خیر نہیں ہو گی۔" دربان بولا۔

"گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی تو بات ہے۔" وہ بولی۔ "تمہارے پاس اتنی تیز رفتار موٹر بوٹیں ہیں۔ کسی ایک میں چلتے ہیں صبح سے پہلے تو یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ ابھی تو گیارہ بجے ہیں تم ایک بجے واپس آ جانا۔"

"نومی! تم جب بھی آتی ہو اپنی بات منوا کر رہتی ہو۔ چلو چلتا ہوں مجھے ایک بجے واپس آنے دینا۔ کیونکہ مجھے بڑی سخت تاکید کی گئی ہے میں لانچوں کا خیال رکھوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔"

پھر وہ دونوں ڈاک کے اس حصے کی طرف گئے جہاں موٹر بوٹیں بندھی ہوئی

تھیں۔ دربان نے ایک بڑی موٹربوٹ کی رسی کھولی۔ اس میں دونوں سوار ہو گئے۔ دربان نے موٹربوٹ کا انجن سٹارٹ کیا۔ جب موٹربوٹ کافی دور نکل گئی تو میں تیزی سے لانچوں کی طرف لپکا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ راستہ صاف مل گیا تھا۔ قدرت نے میری مدد کی تھی۔ سب سے آگے جو لانچ تھی وہ ریٹا تھی۔ میں نے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی۔ اس کی مدد سے میں ریٹا کے عرشے پر پہنچ گیا۔

عرشے سے نیچے آ کر میں نے طاقتور برقی ٹارچ نکالی۔ اس کی روشنی میں' میں نے اس کا چاروں طرف سے جائزہ لینا شروع کیا۔ کوئی آدھے گھنٹے تک میں سر کھپاتا رہا۔ پھر سارے اسرار و رموز میرے دماغ میں آتے گئے۔ اس میں پوشیدہ مقام پر سامان کی گنجائش پیدا کرنے کے لئے کام کروایا گیا تھا۔ کسٹم والے چیکنگ کر کے ان جگہوں سے سامان کو نہیں نکال سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں اضافی ٹینک بھی تھے۔ اس کے علاوہ چاروں طرف سے ڈبل دیواریں اور ڈبل فرش اس طرح سے بنائے گئے تھے کہ اس کا پتا نہیں چلتا تھا۔ دیواروں کے درمیان میں بارہ انچ کا خلاء سا لگتا تھا۔ فرش میں کتنا خلاء تھا اس کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کی جستجو کے بعد مجھے خفیہ بٹن نظر آ گئے جو دیوار گیر گھڑی کے پیچھے دیوار میں نصب تھے۔ ان میں دو بٹن تو دو دیواروں کے تھے اور ایک بٹن فرش کا تھا۔ دیواروں کے بٹن دبانے سے دیوار کوئی تین چار فٹ تک اوپر اٹھ جاتی تھی۔ ڈبل دیواروں کے درمیان جو خلا تھا وہ بارہ انچ کا نہ تھا بلکہ بیس بائیس انچ کا ہو گا۔ اس میں آسانی سے اسلحہ رکھا جا سکتا تھا لیکن فرش میں یہ خلاء کوئی دو فٹ کا تھا۔ دہری دیواروں کو اس خوبصورتی اور مہارت سے بنایا گیا تھا کہ کسٹم والوں کا خیال اس طرف جا نہیں سکتا تھا۔ ان تینوں لانچوں میں کسی ایک میں اسلحہ کی ایک پیٹی بھی نہ تھی۔ چیکنگ کے فوراً بعد ہی اسلحہ کسی نامعلوم جگہ۔ پر اتار دیا گیا تھا۔

میں واپس ہوٹل پہنچا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ٹھٹک گیا۔ میرے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ ادریس الحق اپنے دو

نافظوں کے ساتھ براجمان تھا' مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بھر ئی۔ "ہیلو کیپٹن صبور احمد! کہاں سے تشریف آوری ہو رہی ہے۔"

"عالیہ کی تلاش میں گیا تھا۔" میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

"کیا اس کی تلاش میں سندربن چلے گئے تھے؟" اس کے لہجے میں استہزائی انداز غا۔

"اسے مضافات میں تلاش کرتا رہا تھا شاید وہاں وہ کوئی مکان کرائے پر لے کر رہ رہی ہو۔"

"احمق آدمی وہ اسی ہوٹل میں اسی منزل پر کمرہ نمبر تین سو اکیاسی میں ٹھہری ہوئی تھی۔" وہ تیز و تند لہجے میں بولا۔ "تم تین سو ساٹھ نمبر میں تھے' صرف تیس کمروں کا فرق غا۔ میرے ایک آدمی نے اسے شناخت کر لیا تھا مگر وہ اسے شدید زخمی کر کے فرار ہو گئی۔ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا' کچھ پتا نہیں وہ بے ہوش پڑا ہوا ہے اس کے سر یں شاید اندرونی چوٹیں آئی ہیں۔ شاید اس نے اور اس کے آدمیوں نے اس کے سر پر کسی آہنی چیز سے ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ یعنی ایک طرح سے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"یہ کب کا واقعہ ہے؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"آج دوپہر کا۔" اس نے جواب دیا۔ "جس وقت وہ اپنے کمرے میں لنچ کر رہی تھی تب میرا آدمی اسے ختم کرنے گیا تھا۔ ویٹر برتن لینے گیا تو تب اس واقعے کا علم ہوا۔ تم اس وقت کہاں تھے؟"

"میں اپنے کمرے میں تھا اور مجھے اس واقعے کا کوئی علم نہیں شاید کسی مسافر کو بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ہوٹل کی انتظامیہ نے ہوٹل کی بدنامی کے خوف سے اس واقعے کو بڑی خاموشی سے دبا دیا۔ برابر والے کمرے میں رہنے والوں کو بھی پتا نہ چل سکا.......... اس واقعے کی

تفصیلات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ تم اس عورت سے ایک بار ملنے اور اسے قریب سے دیکھنے کے باوجود بھی شناخت نہ کر سکے مگر میرے آدمی نے اسے دیکھتے ہی شناخت کر لیا تھا۔ وہ کمینی .... روز بروز ہماری راہ میں مشکلات پیدا کرتی جا رہی ہے۔ رات اس نے کوسٹ گارڈ کو ہماری ان لانچوں کے بارے میں جھوٹی اطلاع دے دی کہ اس میں اسلحے کی کھیپ ہے جو جان پورٹ سے ایک غیر ملکی جہاز سے لائی جا رہی ہے۔ کوسٹ گارڈ والوں نے لانچوں کے عملے کو بہت پریشان کیا......... اگر اسے فوراً ختم نہ کیا گیا تو وہ ہمارے لئے اور بھی سنگین خطرہ بن سکتی ہے۔"

"مجھے وہ عورت ہوٹل میں دکھائی نہیں دی۔ ورنہ وہ میرے ہاتھ سے نہیں بچتی۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"وہ ایک بوڑھی عورت کے بہروپ میں تھی۔" ادریس الحق سپاٹ لہجے میں بولا۔ "میں تمہیں ایک ہفتے کا وقت دے رہا ہوں۔ اگر تم نے اسے تلاش کر کے ختم نہیں کیا تو پھر تمہارے جرائم کی دستاویزات پولیس کے حوالے کر دی جائیں گی۔ میں اب تمہیں اس سے زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ وہ عورت کسی زخمی ناگن کی طرح ڈسنے پر تل گئی ہے۔"

اپنی بات ختم کر کے وہ دروازے کی طرف بڑھا تو اس کے پیچھے پیچھے اس کے دونوں آدمی کتوں کی طرح چل پڑے۔ ان کے باہر نکلتے ہی میں نے دروازہ بند کیا۔ تھوڑی دیر تک بستر پر بیٹھا ادریس الحق کی دھمکی پر غور کرتا رہا۔ اب وہ مجھے صرف ایک ہفتے کی مہلت دے گیا تھا مگر اس نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے وہ کب تک اس شہر میں موجود ہے۔ مجھے اس کی رہائش کا پتا چلانا تھا۔ میں سوچتا رہا کہ پتا کس طرح سے چلایا جا سکتا ہے۔

میں نے دوسرے دن صبح دس بجے اس کے ورکشاپ ذیشان کو ٹیلی فون کیا اور اس سے رابطہ قائم ہونے پر ادریس الحق سے رات ہوٹل میں ہونے والی ملاقات کا ذکر کیا اور

اس سے کہا کہ عالیہ کے بارے میں اطلاع دینے کے لئے ادریس الحق سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا اور اس بات پر زور دیتا رہا کہ اسے بتا دیا جائے وہ خود اس کا پیغام پہنچا دے گا۔ میں بھی اڑ گیا کہ یہ بات باس کے سوا میں کسی اور کو نہیں بتا سکتا۔ اشد ضروری ہے۔ اگر اس نے باس کی رہائش کا پتہ نہیں بتایا اور کل کوئی بات ہوئی تو وہ اس کا ذمے دار خود ہو گا۔ تب کہیں جا کر وہ سیدھا ہوا۔ اس نے بتایا کہ ادریس الحق شکار کھیلنے کے لئے سندر بن گیا ہوا ہے۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر نیچے آیا اور کاؤنٹر پر کمرے کی چابی دے کر باہر آیا۔ کوئی فرلانگ بھر پیدل چلا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی میرے تعاقب میں تو نہیں پھر میں نے ایک چوراہے سے ٹیکسی لی اور گھاٹ پہنچ گیا۔ عالیہ کے سٹیمر پر جانے کے لئے موٹر بوٹ کی ضرورت تھی۔ واپسی کے لئے بھی۔ میں نے ایک موٹر بوٹ کرائے پر لی اور عالیہ کے سٹیمر پر پہنچ گیا۔

عالیہ اس وقت ایک عام قسم کی بوڑھی عورت کے بہروپ میں تھی۔ وہ کسی خادمہ کی طرح لگ رہی تھی۔ میں اسے پہچان نہ سکا اس نے یہ بہروپ بڑی مہارت سے بھرا ہوا تھا۔ آنکھوں میں لینس بھی لگا رکھے تھے۔

وہ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گئی۔ "کیا خبر ہے؟ تم نے رات ان لانچوں کو چیک کیا تھا؟"

"خبر تو بعد میں سناؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "پہلے رات کی رپورٹ پیش کر دوں۔ میں نے تمام لانچوں کو اچھی طرح سے چیک کیا۔ ان خفیہ جگہوں کا پتا چلایا جس میں اسلحہ رکھ کر لایا جاتا ہے۔ ان میں اسلحہ نہیں تھا۔ کوسٹ گارڈ کی چیکنگ کے فوراً ہی بعد انہیں کہیں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اب میں نے راز پا لیا ہے۔"

میں نے اسے تفصیل سے ان خفیہ جگہوں کے بارے میں بتا دیا۔ وہ یہ سن کر بھونچکی سی رہ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا خبر لائے ہو؟"

"ادریس الحق سے رات میری ملاقات ہوئی تھی۔" میں نے اسے ادریس الحق اور اپنے درمیان ہونے والی گفتگو سنانے کے بعد کہا۔ "وہ شکار کے لئے سندر بن گیا ہوا ہے۔"

"بہت خوب' بہت اچھی خبر ہے۔" اس کا چہرہ دمک اٹھا اور اس کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں۔ "ہم بھی شکار کھیلنے چلیں گے۔ سب سے دلچسپ اور خطرناک شکار ادریس کا ہو گا۔"

"وہ اس قدر آسان شکار ثابت نہ ہو گا۔" میں نے کہا۔ "وہ اکیلا نہیں ہو گا۔ اس کے ساتھ بہت سارے لوگ ہوں گے۔"

"مزا تو خطرناک شکار کھیلنے ہی میں ہے۔" وہ شگفتگی سے بولی۔ "اس کے ساتھ جتنے بدمعاش ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ ہمارے ساتھ دس بارہ آدمی ہوں گے۔ یہ بھی تربیت یافتہ ہیں۔ اب مقابلہ دوبدو ہو گا۔"

عالیہ نے مجھے اپنے پاس کوئی تین گھنٹے تک روکے رکھا۔ اس دوران ہم نے مختلف منصوبے بنائے۔ آخر یہ طے پایا کہ وہ اس سٹیمر سے سندر بن کل صبح روانہ ہو جائے گی میں دوسرے دن صبح مسافر لانچ سے ایک شکاری کے بھیس میں حلیہ بدل کر سندر بن پہنچوں گا۔ پھر اس نے ایک جدید ترین امریکی خودکار رائفل دی جس میں دوربین بھی نصب تھی۔ یہ رائفل بہت دور تک مار کرنے والی تھی۔ اسے کھولا اور جوڑا جا سکتا تھا میں اسے کیس میں رکھ کر ہوٹل لے آیا۔

عالیہ دوسرے دن علی الصباح سندر بن روانہ ہو گئی۔ میں تیسرے دن' جس لانچ سے روانہ ہوا اس میں اور بھی شکاری سوار تھے۔ یہ غیر ملکی شکاری تھے۔ یہ شکار کا سیزن تھا ان دنوں حکومت کی طرف سے شکار کی عام اجازت ہوتی تھی۔ غیر ملکی شکاریوں نے مجھے بھی شکاری سمجھا تھا انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ میں جانوروں کا شکار کرنے نہیں بلکہ ایک

ظالم شخص کا شکار کرنے جا رہا ہوں۔

سفر کے دوران میں بڑی سنجیدگی سے عالیہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ نہ جانے کیوں یہ عورت میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ میں یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ جس طرح سے ندی کے دو پاٹ ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے اسی طرح ہم بھی نہیں مل سکتے۔ سب سے بڑا فرق طبقاتی دیوار کا تھا۔ وہ ایک جنرل کی بیٹی ہی نہیں تھی بلکہ ایک امیر کبیر ترین عورت تھی۔ میں اس کے خیال سے جتنا جان چھڑانے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی میرے تصور میں آ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

میں اپنی جوانی کے دنوں میں چند دوستوں کے ہمراہ سیر و تفریح کے لئے سندر بن دیکھنے گیا تھا۔ ڈھاکا سے کھلنا' کھلنا سے ڈھاکہ کا سٹیمر میں سفر کرتے وقت یہ جنگل آتا تھا۔ سٹیمر جنگل کے پاس سے ہی گزرتا تھا لیکن یہ رات کے وقت آتا تھا۔ گھپ اندھیرے میں یہ بہت خوفناک دکھائی دیتا تھا۔ درخت کالے دیوؤں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ چاندنی راتوں میں ایک عجیب سا منظر پیش کرتے تھے۔ مگر کبھی کناروں پر کوئی جانور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ بہت بڑا جنگل تھا۔ اس کا بہت بڑا حصہ بنگلہ دیش میں تھا۔ اس کا کچھ حصہ مغربی بنگال میں بھی تھا۔

تیز ترین لانچ نے دن ڈوبنے سے پہلے ہی سندر بن پہنچا دیا تھا۔ یہ ہرا بھرا اور بہت ہی گھنا جنگل تھا۔ میں نے اپنے حلئے میں تبدیلی کر رکھی تھی تاکہ ادریس الحق اور اس کے آدمی مجھے پہچان نہ سکیں۔ عالیہ کا سٹیمر مجھے ایک طرف اور ڈاک سے کچھ فاصلے پر کھڑا دکھائی دیا۔ دوسری طرف چمپا نامی لانچ بھی تھی جس میں ادریس الحق آیا تھا۔ سندر بن جنگل میں شروع میں ریسٹ ہاؤس اور دو تین ہوٹل تھے۔ اس کے علاوہ دکانیں بھی تھیں۔ یہ ہوٹل شکار کے سیزن کے موقع پر خوب چلتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں تاجروں کی آمدورفت پورے سال رہتی تھی جو لکڑی اور بانسوں کے لئے آتے رہتے تھے۔

ریسٹ ہاؤس میں کچھ کمرے خالی تھے اور وہ غیر ملکیوں کو دے دیئے گئے تھے مجھے

ایک ہوٹل میں کمرہ کرایہ پر لینا پڑا۔ یہ کمرہ پہلی منزل پر ملا یہ ہوٹل لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ بہت صاف ستھرا تھا۔ میں نہا کر نکلا تو اندھیرا پھیل گیا تھا۔ میں نے اپنا وہ حلیہ بنایا جس حلئے میں آیا تھا۔ اس میں' میں نے سفید فرنچ کٹ داڑھی کا اضافہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے میرے حلئے میں بہت تبدیلی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے سفید براق بالوں کی وگ بھی پہن رکھی تھی۔

یہ بات میرے علم میں نہیں تھی کہ عالیہ اور ادریس الحق کہاں ٹھہرے ہیں۔ جس وقت میں لان سے اتر رہا تھا تب میں نے کتوں کو عرشہ کے ریلنگ کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔

میں رات کا کھانا کھانے کے لئے اپنے ہوٹل سے نکل کر ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھ گیا۔ ریسٹ ہاؤس میں کھانا بہت اچھا ہوتا تھا۔ یہ بات مجھے لانچ کی کینٹین کے ویٹر نے بتائی تھی۔ مجھے کھانے سے زیادہ عالیہ اور ادریس الحق سے دلچسپی تھی۔ میں ان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔

میں ریسٹ ہاؤس ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک گیا۔ ایک ناقابل یقین منظر دیکھ کر بھونچکا سا ہو گیا۔ کھانے کی میز پر عالیہ اور ادریس الحق ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اس لمحے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کہیں یہ دونوں مل کر مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہیں؟ کیا ان میں آپس میں صلح ہو گئی ہے؟

پہلے تو میں سمجھا کہ نظر کا دھوکا ہے لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔ عالیہ بھی شکاریوں والے لباس میں تھی۔ وہ اپنی اجلی رنگت کی وجہ سے یورپی عورت کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنے دل کو دلاسا دیا کہ شاید ان میں صلح ہو گئی ہے۔ ان کا آپس میں صلح ہو جانا میرے حق میں مفید تھا۔ نہ صرف میرے ہاتھ انسانی خون سے رنگنے سے بچ جاتے بلکہ مجھے میری دستاویزات بھی مل جاتیں۔ ان دونوں کے ملاپ سے میرے دل

نے ایک انجانا سا صدمہ بھی محسوس کیا۔ ایک طرف خوشی ہو رہی تھی تو دوسرے طرف صدمہ سا بھی ہو رہا تھا۔

"سرا کونے والی میز خالی ہے۔" ایک مستعد ویٹر نے مجھے سوچ میں ڈوبا پا کر میرے پاس آ کر مجھے اشارے سے بتایا۔

ان کی میز کے پاس کوئی میز خالی نہ تھی۔ اگر ہوتی تو میں وہاں بیٹھ جاتا تاکہ ان کی باتیں سن سکوں۔ ان کے آس پاس کی تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ کسی میز پر ایک کرسی بھی خالی نہ تھی مجھے مجبوراً اس میز کی طرف جانا پڑا جو ویٹر نے بتائی تھی۔ میں اس میز پر جا بیٹھا۔ یہ میز ایسی تھی کہ میں یہاں سے انہیں باتیں کرتا دیکھ سکتا تھا۔ دونوں کے چہروں کے تاثرات بھی۔ ان کے چہرے میری نظروں کی گرفت میں تھے۔

'وہ دونوں اس وقت خون کے پیاسے جانی دشمن نہیں بلکہ میاں بیوی کی طرح لگ رہے تھے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے اور ادریس الحق کی آنکھوں میں محبت بھری تھی تو عالیہ کی آنکھوں سے خود سپردگی جھانک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سرخی تھی جس نے اسے اور حسین بنا دیا تھا۔ وہ چہک رہی تھی۔ ادریس الحق اس قدر سرشار دکھائی دے رہا تھا جیسے اس نے اپنی کھوئی ہوئی منزل پا لی ہو۔

وہ دونوں کوئی ایک گھنٹہ کے بعد اٹھے۔ کھانے کا بل ادریس الحق نے ادا کیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر نکلے کوئی نصف گھنٹے تک باہر چہل قدمی کرتے رہے تھے۔ میں برآمدے میں بیٹھا ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ میں نے کچھ فاصلے پر عالیہ اور ادریس الحق کے آدمیوں کو بھی مستعد پایا تھا۔ وہ بندوقوں سے مسلح تھے۔

عالیہ اس سے رخصت ہو کر اپنے آدمیوں کے ہمراہ اپنے سٹیمر کی طرف بڑھ گئی ادریس الحق اپنے محافظوں کے ساتھ اپنی لانچ پر چلا گیا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد میں ڈاک پر پہنچا تاکہ عالیہ سے جا کر ملوں اور اس سے پوچھوں کہ کیا ان کے درمیان صلح صفائی ہو گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر میں ادریس الحق کا خون نہیں کروں۔ کہیں ایسا نہ ہو

کہ اس کا خون ہو جائے اور وہ مجھے قانون کے حوالے کر دے۔

ڈاک پر چھوٹی بڑی کشتیاں اور موٹر بوٹس بھی کھڑی تھیں۔ میں ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر چپو چلاتا ہوا عالیہ کے سٹیمر پر پہنچا۔ کتوں نے مجھے دیکھتے ہی بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ مسلح محافظ جو کھانا کھا رہے تھے وہ دوڑے ہوئے آئے۔ وہ مجھے اس حلئے میں پہچان نہ سکے تھے۔ جب میں نے انہیں اپنی شناخت کرائی تب وہ مجھے اندر لے کر گئے۔

عالیہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہو گئی۔ "اچھا تو یہ تم تھے؟ میں نے تمہیں ریسٹ ہاؤس کے ڈائننگ اور اس کے برآمدے میں بھی دیکھا تھا۔ تم نے ہم پر مسلسل نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ تم نے اتنا شاندار بہروپ بھرا ہوا ہے کہ میں بھی نہ پہچان سکی۔"

"میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا کیا وہ صحیح تھا؟" میں نے کہا۔ "اگر آپ دونوں میں صلح ہو گئی ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ مبارک ہو۔"

"آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ کبھی سچ نہیں ہوتا ہے۔ ہم دونوں کے درمیان صلح ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالفرض محال صلح ہو گئی ہوتی تو میں اپنے سٹیمر پر واپس نہ آتی۔ اس کی لانچ پر چلی جاتی۔"

"میں نے اور دنیا والوں نے جو دیکھا وہ کیا تھا؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

"تم نے جو کچھ دیکھا وہ ایک دھوکا تھا۔ ایک فریب تھا۔ ایک اداکاری تھی دنیا والوں کو دکھانے کے لئے۔" وہ سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگی۔ "دراصل ہم دونوں کے درمیان جو سرد جنگ جاری ہے اس کے بارے میں دنیا والے نہیں جانتے ہیں۔ نہ کسی کو پتا ہے۔ ہم دونوں اندر ہی اندر ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ یہ ہم دونوں کی مجبوری ہے کہ ہم کھل کر لڑ نہیں سکتے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے مجھ سے کہا کہ عالیہ! اب تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکو گی۔ اب تم میرے جال میں پھنس چکی ہو تم ہوٹل میں محض اتفاقیہ بچ گئیں۔ یہاں میرے ساتھ کرائے کے قاتل آئے ہوئے ہیں۔ اب تمہاری ساری دولت' جائداد اور زمینیں نہ صرف میری ہوں گی بلکہ ساری

زندگی' کے لئے میرے راستے کا پتھر ہٹ جائے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں تمہارا یہ چیلنج قبول کرتی ہوں۔ تم یہ شاید بھول رہے ہو کہ اونچا اڑنے والا قبر کی گہرائی میں جا گرتا ہے۔"

"آپ ہوشیار رہیں۔ میں بھی آپ کی حفاظت کے لئے آس پاس موجود رہوں گا۔"

"کل صبح میں شکار پر جا رہی ہوں۔" عالیہ بولی۔ "ناشتے کے بعد نکلوں گی۔ ناشتہ ریسٹ ہاؤس میں کروں گی۔"

میں ناشتہ کرنے کے لئے ریسٹ ہاؤس پہنچا تو اس وقت نو بج رہے تھے۔ ناشتے کی میز پر میں نے عالیہ اور ادریس الحق کو دیکھا وہ دونوں آج پھر دشمنوں کی طرح نہیں بلکہ دوستوں کی طرح میاں بیوی کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ عالیہ نے جینز' فل بوٹ اور خاکی رنگ کی آدھی آستینوں والی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے سر پر ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ گاؤں کی عالیہ بیگم سے یکسر مختلف دکھائی دے رہی تھی۔ کرسی پر ان کی بندوقیں' تھیلے' دوربین اور تھرماس رکھے ہوئے تھے۔ اس وقت ڈائننگ ہال میں اور بھی شکاری ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔

کوئی نصف گھنٹے کے بعد ایک ایک کر کے شکاری ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں آئے انہیں دیہاتیوں نے گھیر لیا جو جانور بیچنے کے لئے آئے تھے۔ غیر ملکی شکاریوں نے بغیر کسی مول تول کے جانور خرید لئے۔ ہم وطن مول تول کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد شکاری دو دو اور تین تین کے گروپ بنا کر مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ کچھ تو جیپوں میں چل پڑے۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ عالیہ' ادریس الحق کے ہمراہ شمال کی جانب چل پڑی۔ اس جانب ہرن کا شکار کثرت سے ملتا تھا۔ ادریس الحق کے ساتھ عالیہ کا جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ معلوم نہیں عالیہ کی کیا مصلحت تھی۔ اس نے کیا سوچا تھا۔ مجھے اس کی بے وقوفی پر سخت غصہ آیا۔

میں غیر محسوس انداز سے درختوں کی آڑ میں ہوتا ہوا فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ادریس الحق کا کوئی آدمی میرے تعاقب میں تو نہیں ہے۔ کوئی نہیں تھا۔ ادریس الحق نے شاید اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا عالیہ کو ختم کرنے کا کیا منصوبہ تھا۔ میرے بہت سوچ بچار کرنے پر بھی ذہن میں نہیں آسکا۔

کوئی دو تین فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مچانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جگہ جگہ پر مچانیں بنی ہوئی تھیں۔ ادھر شیر' چیتے' تیندوے اور شیر ببر بھی نکل آتے تھے۔ عالیہ یا ادریس الحق نے کوئی جانور نہیں خریدا تھا۔ وہ دونوں ایک مچان پر چڑھ گئے تو میں بھی ایک ایسی مچان پر چڑھ گیا کہ جہاں سے ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھ سکوں۔ میری رائفل لوڈ تھی۔ میں دوربین سے انہیں دیکھنے لگا۔ ادریس الحق اور عالیہ دوربین سے مخالف سمت پر شکار دیکھ رہے تھے۔ مجھے بہت دور ایک دو ہرن قلانچیں بھرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ سورج کی روشنی درختوں سے چھن رہی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ دھوپ میں تمازت بالکل نہ تھی ہوا بھی بڑی فرحت بخش چل رہی تھی۔ چاروں طرف گہرا سناٹا طاری تھا اور بہت دور سے وقفے وقفے سے فائرنگ کی آواز تھوڑی دیر تک سنائی دیتی رہی تھی۔ میں چوکنا اور ہوشیار تھا۔ مجھے اب لگ رہا تھا کہ کوئی منحوس واقعہ رونما ہونے والا ہے اور ادریس الحق نہ صرف شاطر اور کمینہ خصلت تھا بلکہ بے رحم اور بے حد سفاک بھی تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہرن کا ایک بچہ کہیں سے قلانچیں بھرتا ہوا ان کی مچان سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گیا یہ بہت ہی چھوٹا اور پیارا سا بچہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی عالیہ اپنے آپ پر قابو نہ پا سکی۔ اسے پکڑنے کے لئے مچان سے اتر کے اسے چمکارتی ہوئی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ اس نے اپنی بندوق مچان پر ہی چھوڑ دی تھی۔ ہرن کے بچے نے اسے دیکھا تو وہ تھوڑی دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ عالیہ اس کی طرف غیر محسوس انداز سے بڑھنے لگی۔ وہ

ہرن کے بچے کے قریب پہنچی اور بجلی کی سی سرعت سے جھپٹ کر اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ بچہ گود میں سہا ہوا سا لگ رہا تھا۔ عالیہ اسے پیار کرنے لگی۔

جبھی بہت قریب سے بڑے زور کی شیر کی دھاڑ سنائی دی۔ عالیہ بچے کو گود میں لے کر مچان کی طرف لپکی تھی کہ ایک دم سے ٹھٹک کے رک گئی۔ اس کے سامنے جنگل کا بادشاہ کھڑا ہوا تھا۔ عالیہ کی گود سے ہرن کا بچہ گرا' وہ سنبھل کر ایک سمت دوڑ گیا۔ شیر نے اس شکار کی طرف توجہ نہیں دی وہ عالیہ کو دیکھ کر دھاڑ رہا تھا۔ عالیہ دہشت سے تھر تھر کانپنے لگی تھی۔ ادریس الحق نے شیر کو مارنے کے لئے اپنی بندوق سیدھی نہیں کی بلکہ وہ اسے استہزائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

عالیہ کی موت کے لئے اسے ایک سنہرا موقع ملا تھا۔ وہ اسے شیر کا تر نوالہ بنا کر اپنے انتقام کی آرزو پوری کرنا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سفاک چمک اور چہرے پر درندگی چھائی ہوئی تھی۔ میں رائفل کی دوربین سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی رائفل سے شیر کا نشانہ لیا۔ شیر اس پر حملہ کرنے کے لئے پر تول رہا تھا۔

پھر میں نے لبلبی پر دباؤ ڈال کر شیر پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ چند لمحوں کے بعد شیر زمین پر گرا پھر اس نے تڑپتے ہوئے دم توڑ دیا۔ اس کے زخموں سے رستا ہوا لہو زمین کو سرخ کرنے لگا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے ادریس الحق یک لخت اچھل پڑا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ فائرنگ کہاں سے ہوئی۔ اس لمحے میرے لئے بہترین موقع تھا ادریس الحق کو ختم کرنے کا۔ اس کے لئے صرف ایک گولی کافی تھی۔ مجھے اس سے اچھا موقع پھر کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ اسے کس نے قتل کیا۔

میں نے ادریس الحق کی جانب رائفل کا رخ کر کے شست باندھی دوربین کی مدد سے میں نے اسے نشانے کی زد میں لیا۔ میری نفرت عود کر آئی اور رگوں میں لہو ابلنے لگا۔ اس شخص نے مجھے کیسا ستایا تھا؟ مجھے ایک عورت کو قتل کرنے کے لئے بلیک میل

کیا۔ اس کے علاوہ وہ اسلحہ مافیا کا سربراہ بھی تھا۔ اس نے ملک بھر میں کشت وخون کا بازار گرم کرنے کے لئے اسلحہ تخریب کاروں کے ہاتھ بیچا تھا اور اب بھی بیچ رہا ہے۔ نئی کھیپ اس نے دو دن پہلے ہی پہنچائی ہے۔ وطن فروش بے ضمیر ہے۔ ملکی سلامتی کا دشمن ہے وہ عالیہ کا مجرم ہے۔ میرا مجرم ہے ملک وقوم کا مجرم ہے اس نے دولت کی خاطر انسانوں کا شکار کیا۔ میں اسے قتل کرنے میں حق بجانب ہوں۔ پھر ایک نادیدہ آواز نے میرے دل میں سرگوشی کی......... نہیں تم اسے قتل نہیں کرسکتے سزا نہیں دے سکتے یہ قانون کا مجرم ہے۔ اسے قانون سزا دے گا۔ تمہارے پاس ٹھوس ثبوت ہے تو اسے پکڑ کر قانون کے حوالے کردو۔ اگر تم نے اسے قتل کیا تو تم قاتل کہلاؤ گے؟ تمہیں قانون نے قتل کرنے کا لائسنس تو نہیں دیا ہے؟

میں نے اپنی رائفل کی نال نیچی کرلی پھر میں نے اس سمت دیکھا۔ عالیہ درخت کے تنے کے سہارے کھڑی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی ادریس الحق اپنی اور عالیہ کی بندوقیں لے کر نیچے اتر آیا تھا۔ وہ عالیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس وقت ایک جیپ مخالف سمت سے تیزی سے آکر شیر کی لاش سے تھوڑے فاصلے پر رکی۔ اس میں چار پانچ غیر ملکی شکاری سوار تھے۔ جیپ کے رکتے ہی وہ نیچے اتر آئے۔ عالیہ اتنی دیر میں سنبھل چکی تھی۔ اس نے اپنی خوف ودہشت کی کیفیت پر قابو پالیا تھا۔ ادریس الحق اس کے قریب پہنچ کر رکا تو عالیہ نے اسے غضبناک نظروں سے گھورا اور اس کے ہاتھ سے ایک جھٹکے سے اپنی بندوق لے لی اور وہ تیزی سے واپس چل پڑی۔ ادریس الحق وہیں رک گیا۔ کیونکہ وہ شکاری اس سے کچھ دریافت کررہے تھے۔

ادریس الحق نے شیر پر گولی نہ چلا کر ایک طرح سے اسے قتل کرنے اور انتقام لینے کی کوشش کی تھی۔ اگر میں اس مچان پر نہ ہوتا اور میرے پاس اس کی دی ہوئی جدید ترین خودکار رائفل نہ ہوتی تو وہ ادریس الحق کے انتقام کا نشانہ بن جاتی اور اس طرح اس کے راستے کا ایک بڑا پتھر ہٹ جاتا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد میں عالیہ سے ملنے اس کے سلیپر پہنچا تو وہ شدید اضطراب کے عالم میں ٹہل رہی تھی اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی اس کیفیت میں قدرے کمی آگئی۔ وہ ممنونیت سے بولی۔ "کیپٹن صبور احمد! آج تم نے دوسری مرتبہ میری جان بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اسے مرتے دم تک بھلا نہ سکوں گی۔ تمہارا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"آپ کی جان اوپر والے نے بچائی ہے۔ شکر اس کا ادا کریں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ سخت ہوگیا۔ "یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ آپ کے خون کا پیاسا ہے اور اس نے کل ہی آپ کو یہاں قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ پھر بھی آپ اس کے ہمراہ شکار پر چلی گئیں۔"

"میں اسے یہ تاثر دینے ساتھ گئی تھی کہ میں کوئی بزدل عورت نہیں ہوں تم نے میری جان لینے کی کوشش کی تو تم زندہ نہ بچ سکو گے۔" وہ ندامت سے بولی۔

"آپ نے اپنی اس بہادری کا نتیجہ دیکھ لیا؟ آئندہ بھول کر بھی ایسی حماقت نہ کریں۔" میں نے اسے تاکید کی۔

"تم نے خبیث کو زندہ کیوں چھوڑ دیا؟ کتنا اچھا موقع ملا تھا اسے ختم کرنے کا اس کے لئے ایک گولی کافی تھی۔"

"آپ کے زندہ بچ جانے کی خوشی میں' میں اسے قتل کرنا بھول گیا تھا۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"اب اسے کس طرح سے ختم کیا جا سکتا ہے؟" عالیہ نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "اگر وہ یہاں سے زندہ سلامت چلا گیا تو پھر اسے قتل کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔"

"اوپر والا بہت بڑا کارساز ہے۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "وہ ظالموں کو بخشتا نہیں

ہے ان سے دنیا اور آخرت میں حساب لیتا ہے۔"

"میں اتنا چاہتی ہوں کہ یہاں سے وہ نہیں اس کی لاش جائے۔"

ہم نے کوئی چار گھنٹے سٹیمر پر گزارے اور ہم منصوبے بناتے رہے۔ اس وقت ایک ایسے منصوبے کی ضرورت تھی کہ عالیہ پر کوئی آنچ نہ آئے۔ سانپ بھی مرجائے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

میں ساری رات ایک منصوبہ ذہن میں پکاتا رہا تھا۔ اس لئے صبح بیدار ہوا تو دس بج رہے تھے۔ میں تیار ہو کر ریسٹ ہاؤس جانے کے بجائے سیدھا سٹیمر پر پہنچا تاکہ عالیہ کو یہ منصوبہ بتاسکوں۔ میرا خیال تھا کہ عالیہ ناشتہ کرکے واپس آچکی ہوگی۔ میں نے اسے شکار پر جانے سے منع کیا تھا۔ سٹیمر پر وہ موجود نہیں تھی۔ اس کے آدمی سے معلوم ہوا کہ وہ صبح نو بجے ناشتہ کرنے جو گئی تھی اب تک واپس نہیں آئی ہے۔ فوراً ریسٹ ہاؤس پہنچا۔ اس کے ڈائننگ ہال میں عالیہ دکھائی نہیں دی۔ البتہ ادریس الحق موجود تھا۔ وہ چار پانچ شکاریوں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس وقت اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے بلند آواز سے اپنے ساتھیوں سے کہا تاکہ ہال میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی سن لیں۔ "میری بہادر بیگم میرے منع کرنے کے باوجود اکیلی ہی شیر کا شکار کرنے چلی گئی ہیں۔ مجھے اجازت دیں میں بھی چلوں۔ وہ کسی مچان پر میرا بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں گی۔ گڈ بائی۔"

اتنا کہہ کر اس نے باری باری ہر ایک سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا پھر اس نے اپنا تھیلا اٹھا کر کندھے پر لٹکایا۔ دوربین اٹھا کر گلے میں پہن لی۔ پھر اپنی بندوق اٹھا کر برآمدے کی طرف بڑھا۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ عالیہ سٹیمر پر تھی نہ یہاں۔ میں نے اسے شکار پر اکیلے جانے سے منع کیا ہوا تھا۔ آج اس کا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنی بندوق بھی نہیں لی تھی۔ وہ صبح نو بجے یہاں ناشتہ کرنے کے لئے آئی تھی

اور پھر یہ جگہ ایسی نہ تھی کوئی شخص غیر مسلح سیر و تفریح کے لئے نکل جائے۔ قریب میں ایک گاؤں تھا۔ گاؤں والے بھی اس طرف آتے تھے تو وہ مسلح ہوتے تھے۔ کیونکہ درندے اس طرف بھی آنکلتے تھے۔

میں نے ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں کچھ سوچ لیا تھا۔ میں تیزی سے لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ ایک دیہاتی اس سے منت سماجت کر رہا تھا کہ ایک بکری خرید لے۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ "میں نے پہلے ہی سے ایک بکری کا انتظام کرلیا ہے۔"

"سر!" میں نے ادریس الحق کو مخاطب کیا۔

ادریس الحق نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے مجھے اس حلئے میں پہچانا نہیں تھا۔ وہ خشک لہجے میں بولا۔ "کون ہو تم؟"

"کیپٹن صبور احمد۔" میں نے جواب دیا۔

وہ بُری طرح چونکا۔ "میں نے شاید تمہیں کل دیکھا تھا۔ تم کب آئے؟ یہاں کس لئے آئے؟"

"عالیہ بیگم کی تلاش میں اور آپ کا حکم بجالانے کے لئے آیا ہوں۔"

"مگر تم نے کل مجھ سے رابطہ قائم کیوں نہیں کیا؟" اس کا منہ بن گیا۔

"اس لئے کہ آپ بہت مصروف تھے اور میں بھی بہت تھکا ہوا تھا اور پھر سارا دن منصوبہ بناتا رہا تھا۔

"ویسے تم بہت اچھے موقع پر آئے ہو۔ مجھے ایک معتبر عینی گواہ کی سخت ضرورت تھی۔ میرے ساتھ چلو۔

"آج عالیہ بیگم دکھائی نہیں دے رہی ہیں؟ کہیں وہ واپس تو نہیں چلی گئی؟"

"وہ میرے قبضے میں ہے۔" وہ استہزائی لہجے میں بولا۔ "آج اس کی لاش ہی واپس جائے گی۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر شمال کی جانب تیزی سے چل پڑا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عالیہ کس طرح سے اس کے قبضے میں آ گئی ہے۔ میں نے اس سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ شاید اس کے آدمیوں نے عالیہ کو اغوا کر کے جنگل میں رکھا ہوا تھا۔ اب وہ اس طرف جا رہا تھا۔

پھر ہم ایک جگہ رک گئے۔ عالیہ ایک درخت سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کے پیروں کے پاس ایک بندوق پڑی ہوئی تھی۔ یہ بندوق عالیہ کی نہیں تھی۔ ادریس الحق کی تھی۔ ادریس الحق کے ہاتھ میں ویسی ہی ایک اور بندوق تھی۔ ادھر کوئی بھی نہ تھا ہم دونوں کے سوا۔

وہ عالیہ کے پاس جا کر تمسخر آمیز لہجے میں بولا۔ "حیرت کی بات ہے۔ تم اب تک زندہ ہو۔ کوئی درندہ ادھر نہیں آیا؟"

عالیہ بڑی دہشت زدہ سی ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ وہ اس کی بات سن کر بھڑک اٹھی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بزدل اور کمینے ہو۔ ایک عورت سے کہیں اس طرح مقابلہ کیا جاتا ہے۔"

"تم نے مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے تم سے انتقام لینے کی اس سے اور کوئی بہتر صورت نہیں تھی کہ تمہیں شیر کا نوالہ بنا دیا جائے اس طرح سے میں قانون کے ہاتھوں سے بھی بچ جاؤں گا۔" اس نے بڑے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"قانون کے ہاتھوں سے کوئی نہیں بچ سکا ہے' تم کیا بچو گے؟" وہ پھنکاری۔

"قانون؟" وہ ہنسا۔ "قانون حکومت کا نہیں میرا چلتا ہے۔ قانون کے محافظ میری جیب میں ہیں۔ میرے خریدے ہوئے ہیں۔ میں بیس برس سے قانون کی مسلسل خلاف ورزی کر رہا ہوں۔ آج تک قانون میرا کچھ بگاڑ نہیں سکا۔ میں نے نہ جانے کتنے قتل کئے اور کرائے مگر مجھ پر آنچ نہ آ سکی' تمہارے مرجانے سے میرا بال تک بیکا نہیں ہو گا۔ پھر تمہاری ساری دولت اور جائداد میرا تمام نقصان پورا کر دے گی۔"

عالیہ نے اس کے منہ پر تھوک دیا پھر وہ غضبناک ہو کر بولی۔ "تم قانون قدرت کو بھول رہے ہو؟"

"قانون قدرت۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تم قانون قدرت کے انتظار میں بیٹھی رہو۔ میں دیکھتا ہوں وہ تمہاری کیا مدد کرتا ہے؟" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "چلو ہم لوگ چل کر مچان پر بیٹھتے ہیں۔" اس نے قریب بنی ہوئی مچان کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ کس لئے؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ کوئی شیر آ جائے' پھر اسے چیر پھاڑ کے کھا جائے؟" وہ سفاک لہجے میں بولا۔

"اگر شام تک کوئی شیر نہ آئے تو؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"چونکہ بہت سارے شکاری' شکار کے لئے نکلے ہوئے ہیں اس وجہ سے شاید کوئی شیر ادھر نہ آئے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" اس نے پوچھا۔

"انہیں کھول دیا جائے اور جنگل کے اندر تک لے جایا جائے پھر کوئی شیر شاید آ جائے۔ ایک دو گھنٹے میں کام تمام ہو جائے گا۔" اسے میری تجویز بہت پسند آئی۔ اس کے کہنے پر میں نے رسی کھول کر عالیہ کو آزاد کر دیا۔ اس نے زمین پر سے عالیہ کی بندوق اٹھا لی تھی۔ ہم عالیہ کو جنگل کے اندر کی طرف لے جانے لگے پھر میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی اور میں نے اسے یہ تجویز پیش کی کہ عالیہ کو اس طرح ساتھ لے کر چلنے میں خطرہ ہے۔ اس کے اور ہمارے درمیان بیس تیس گز کا فاصلہ ہونا چاہئے۔ کسی درندے کے حملہ کرنے کی صورت میں یہ ہمارے پیچھے چھپ سکتی ہے۔ اس صورت میں ہم بھی درندے کے حملے سے بچ نہ سکیں گے۔

عالیہ ہم سے کوئی تیس گز کے فاصلے پر چل رہی تھی۔ میں دائیں جانب تھا اور

ادریس الحق نے ایک بندوق میرے حوالے کر دی تھی۔ ہم عالیہ کو بندوق کی زد میں لئے چل رہے تھے۔ نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ قریب سے غرانے کی آواز سنائی دی۔ ہم لوگ چوکنا ہو کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے بندوق زمین پر رکھ کر رائفل تان لی۔ ادریس الحق بھی بندوق تان کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ قریبی جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ ادھر ہی ادریس الحق کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہاں سے شیر نمودار ہوا اس نے ادریس الحق پر چھلانگ لگائی۔ ادریس الحق نے اس کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ اس میں سے گولی نہیں نکلی۔ کلک کی آواز نکل کر رہ گئی۔ اس نے دوبارہ ٹریگر دبایا۔ پھر کلک کی آواز ہوئی۔ دراصل غلطی سے اس کے ہاتھ میں خالی بندوق تھی۔ یہ وہ بندوق تھی جو عالیہ کے پیروں کے پاس پڑی تھی۔ بھری بندوق میرے پاس تھی۔ اسے تیسرا فائر کرنے کی نوبت نہیں آئی شیر اس پر حملہ آور ہو چکا تھا۔

جتنی دیر میں' میں نے اپنی رائفل سے نشانہ لے کر شیر پر گولیاں برسائیں اتنی دیر میں شیر اسے ختم کر چکا تھا۔ اتفاق سے اس وقت شکاریوں کی جیپ بھی آ نکلی تھی۔ عالیہ کے لئے اس نے گڑھا کھودا تھا۔ وہ خود گڑھے میں جا گرا تھا۔

☆------☆------☆

پولیس کو بیانات دینے اور رسمی کارروائی کرنے میں پورے تین گھنٹے لگ گئے ادھر عالیہ نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اس کے لئے رونا بہت ضروری تھا۔ اس نے رونے کی اداکاری بہت اچھی طرح کی۔ ادریس الحق کی لاش اس کی لانچ میں رکھی ہوئی تھی۔ ہم کھلنا واپس جا رہے تھے۔

جب کھلنا ٹرمینل قریب آ رہا تھا تب میں اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "تجہیز و تکفین کے بعد مجھے میری تمام دستاویزات ضرور واپس کر دیں تاکہ اب میں ایک پُرسکون زندگی گزار سکوں۔"

"لیکن میں وہ دستاویزات تمہیں نہیں لوٹاؤں گی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"کیا!" میں نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ "کیا میری خدمات کا یہی صلہ ہے؟"

"میں تمہیں تمہاری خدمات اور احسانوں کا بہت زبردست صلہ دینا چاہتی ہوں۔"

"بلیک میل کی صورت میں؟"

"بات یہ ہے کہ عورت چاہے کتنی بہادر' طاقتور اور دولت مند کیوں نہ ہو وہ ایک مرد کے سہارے کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی۔ اسے قدم قدم پر مرد کی رفاقت کی ضرورت پڑتی ہے۔ مجھے اب تمہاری ضرورت ہے اور............" اس نے توقف کر کے اپنے پرس سے ایک تصویر نکالی اور میری طرف بڑھائی۔ "اور اسے ایک باپ کی۔"

میں نے تصویر لے کر دیکھی۔ وہ پارو کی تصویر تھی۔

☆------ ختم شد ------☆